تشدد ہماری روایت نہیں

عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے کی عالمی مہم

جواز، انصاف نہیں!

ثقافت، روایت اور مذہب کے نام پر عورتوں کے خلاف تشدد

تشدد ہماری روایت نہیں

عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے کی عالمی مہم

جواز، انصاف نہیں!

ثقافت، روایت اور مذہب کے نام پر عورتوں کے خلاف تشدد

از شائنہ گریف

مترجم: امجد محمود

خواتین زیرِ اثر مسلم قوانین
Women living under muslim laws
النساء في ظل قوانين المسلمين
Femmes sous lois musulmanes

شرکت گاہ
ویمنز ریسورس سنٹر

جملہ حقوق بنام شرکت گاہ اور خواتین زیرِ اثر مسلم قوانین (WLUML) محفوظ ہیں 2010ء

ادارت : عارفہ نازلی
ڈیزائننگ : عبدالستار
سرِ ورق : محمد عاصم
پرنٹر : شاہد پرویز (کریٹو ڈیزائننگ اینڈ پرنٹنگ)
پبلشر : شرکت گاہ، ویمنز ریسورس سنٹر
P.O.Box.5192 لاہور، پاکستان
ای میل : لاہور : pubs@sgah.org.pk
کراچی : shirkat@cyber.net.pk
پشاور : sgpesh@gmail.com
ویب سائٹ : www.shirkatgah.org
مالی معاونت : NOVIB، Royal Norvegian Embassy اور SDC

اس کتابچے کی تیاری کے سلسلے میں ہم نورین توکل اور خاور ممتاز کی معاونت کیلئے انتہائی مشکور ہیں۔
یہ معلوماتی کتابچہ انگریزی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی کتابچے کی ادارت روشیل ٹرمن نے کی تھی۔

''عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے'' کی عالمی مہم (SKSW)
خواتین کا ثقافتی پروگرام، تجدید مطالبہ اور اس کی تعریف نو
خواتین زیرِ اثر مُسلم قوانین

خلاصہ

اس کتابچے میں ثقافت اور روایت کی آڑ میں عورتوں پر کیے جانے والے تشدد کے بارے میں ایک سروے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ عورتوں پر تشدد کی کیا کیا شکلیں ہوتی ہیں اور کس طرح اس کا جواز ثقافت میں ڈھونڈا جاتا ہے بلکہ تبدیلی کیلئے سفارشات اور حل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے کی عالمی مہم (SKSW) ثقافت اور عورتوں کیخلاف تشدد کے حوالے سے مختلف پروگرام شروع کر رہی ہے اور اس مقصد کیلئے سینیگال، افغانستان، نائیجیریا، پاکستان، انڈونیشیا، ایران اور سوڈان میں مقامی ساتھی بھی چُنے گئے ہیں۔ اس کتابچے میں ثقافت، روایت اور مذہب کے بارے میں عمومی جائزہ لیا گیا ہے جنہیں زیرِ نظر ملکوں میں عورتوں پر تشدد کی مختلف شکلوں کو جائز قرار دینے اور انہیں جاری رکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ایسے دلائل کا مقابلہ کرنے کیلئے مقامی طریقے بھی واضح کیے گئے ہیں۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ثقافت اور مذہب انفرادی اور اجتماعی شناخت کیلئے بہت اہم مقام رکھتے ہیں اس کتابچے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس بحث کو کیسے تشدد کرنے والوں کو بَری قرار دینے اور مخالفوں کو چُپ کروانے کیلئے غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کتابچے کا اختتام حقوق کیلئے کام کرنے والوں، اہل علم اور پالیسی بنانے والوں کیلئے سفارشات پر ہوتا ہے۔

فہرست

تعارف ____ 6

ثقافت اور مذہب ____ 9

- ''ثقافت اور مذہب'' لازم وملزوم ____ 9
- ''ثقافت اور مذہب'' کے نام پر عورتوں پر تشدد ____ 11
- مسلح تصادم کی صورت میں ثقافتی جواز پر مبنی عورتوں کیخلاف تشدد ____ 13

ثقافت اور مذہب کے نام پر عورتوں کیخلاف تشدد کو جائز قرار دینے کی مختلف اشکال ____ 15

- غیرت کے نام پر قتل اور متعلقہ جرائم ____ 15
- جبری ازدواجی تعلق ____ 18
- سنگساری ____ 19
- کوڑے مارنا ____ 21
- جبری شادی ____ 22

ثقافتی و مذہبی جواز کے ساتھ عورتوں پر ہونے والے تشدد سے نمٹنے کی حکمت عملیاں ____ 25

- مذہبی بنیاد پر مبنی حکمت عملیاں ____ 25
- مقامی سول سوسائٹی کے اقدامات ____ 27
- اقوام متحدہ کے اقدامات ____ 30
- ریاستوں کی جوابدہی ____ 33
- سفارشات ____ 36

کتابیات ____ 38

تعارف

عورتوں پر تشدد کرنے کی وباء دنیا بھر میں تمام ثقافتوں، مذاہب اور اقوام میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں اور کرّۂ ارض پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں عورتیں محض اس لیے تشدد کا نشانہ نہ بنتی ہوں کہ وہ عورتیں ہیں لیکن عورتوں پر تشدد کی اس عالمی نوعیت کے باوجود ذرائع ابلاغ اور کچھ حکومتی عناصر اس مسئلہ پر بحث کو یہ کہہ کر دنیا کے کچھ مخصوص علاقوں تک محدود دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عمل ان علاقوں کی ثقافتی یا مذہبی ''پسماندگی'' کی علامت ہے[1]۔ دوسری جانب ایسی روایات کے خلاف عالمی معاہدوں اور کوششوں میں نمایاں اضافے کے باوجود نام نہاد ترقی پسندوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ''ثقافت'' اور ''مذہب'' کی آڑ میں عورتوں کے انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں کی مذمت کرتے ہوئے گھبراہٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ عالمی تنوع اور ثقافت کے مختلف رنگوں کے احترام کی حقیقی خواہش کے تحت عالمی برادری خصوصاً مغربی دنیا میں کئی لوگ انسانی حقوق کے انہی معیارات کے معاملے میں نرمی دکھا رہے ہیں کہ جنہیں وہ خود فروغ دینا چاہتے ہیں اور ''مستند'' ثقافتی، مذہبی یا روایات کے معمول کے طور پر پیش کیے جانے پر عورتوں پر تشدد کے مسئلے سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔

لیکن کیا یہ رواج واقعی کسی ''مستند'' ثقافتی نقش کا حصہ ہیں؟ ایسی ''ثقافتوں'' کے طرفدار کون ہیں؟ یہ کن کے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں؟ اور جب بات عورتوں پر تشدد کے ثقافتی و مذہبی جواز کی ہو تو خود عورتوں کی اپنی آواز کہاں پر ہے؟

اس کتابچے میں ثقافت کے نام پر عورتوں پر روا رکھے جانے والے تشدد بارے ایک سروے پیش کیا گیا ہے کہ عورتوں پر تشدد کیلئے جواز کس طرح سے ''ثقافت'' میں تلاش کیا جاتا ہے، اس تشدد کی کیا اشکال ہو سکتی ہیں اور تبدیلی کیسے لائی جا سکتی ہے۔ 2007ء سے ''عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے'' کی عالمی مہم[2] (SKSW) موجودہ تحریکوں کے ساتھ مل کر ثقافتی جواز

کے طور پر ہونے والے عورتوں پر تشدد کے خلاف کام کر رہی ہے۔ اس مقصد کی خاطر ساتھی تحریکوں کی مدد کی جاتی ہے، تجزیاتی رپورٹیں تیار کی جاتیں اور ''ثقافت، مذہب اور روایت'' کے نام پر عورتوں پر تشدد کے واقعات کو قلم بند کیا جاتا ہے۔

خواتین، ثقافت اور تشدد کے موضوع سے انصاف کیلئے کئی جلدیں درکار ہوں گی تاہم جگہ کی قلت کے پیش نظر خواتین پر تشدد اور ثقافت کو'' خواتین کا ثقافت کیلئے تجدید مطالبہ اور اس کی تعریف نو: جسمانی، ذاتی اور عوامی جگہوں پر حقوق منوانے کے پروگرام'' (WRRC) کے وسیع خاکے میں پیش کیا جائے گا۔ یہ مطالعہ (Study) بھی اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ یہ تین سالہ پروگرام تین مرکزی نکات کو سامنے رکھ کر عورتوں اور ثقافت کے گرد گھومنے والے مسائل کا احاطہ کرتا ہے: صنفی بنیاد پر تشدد، عورتوں کی جنسیت اور جنسی حقوق، اور قوانین جائیداد و وراثت۔

خواتین زیر اثر مسلم قوانین بین الاقوامی یک جہتی نیٹ ورک اور ادارہ برائے خواتین کی بااختیاری (IWE) کی مشترکہ کاوش WRRC پروگرام کا مقصد عورتوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ حقوق حاصل کرنے کیلئے ثقافتی رواجوں (بشمول مذہب اور روایت کے) پر قابو پا سکیں اور ان کی از سر نو تشکیل کر سکیں۔ انہیں اتنا بااختیار بنا دیا جائے کہ وہ عورتوں کو اختیار سے محروم کرنے اور ان کے جسموں اور حقوق کی خلاف ورزی کو جائز قرار دینے کی ثقافتی/ مذہبی بحثوں کا مقابلہ کر سکیں۔ SKSW مہم کا اس پروگرام میں حصہ، تشویش کے ان تینوں پہلوؤں کے باہمی ربط کو فاش کرنا ہے مثلاً ''ثقافت'' کو جائز قرار دینے کے ہتھیار کو استعمال کر کے کیسے عورتوں پر تشدد کو ایک منظّم طریقے سے جاری رکھا جاتا ہے اور کیسے ثقافتی جواز رکھنے والی تشدد کی قوتیں عورتوں کے جسموں اور ان کی جنسیت کو کنٹرول کر کے ان کے حقِ خود اختیاری کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس مقصد کیلئے SKSW مہم سینیگال، افغانستان، نائیجیریا، پاکستان، انڈونیشیا، ایران اور سوڈان میں دوسرے شراکت داروں کے ساتھ مل کر ''ثقافت'' خواتین اور تشدد کے موضوع پر پروجیکٹس شروع کر رہی ہے۔

اس کتابچے میں ثقافت، روایت اور مذہب کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا جائے گا جنہیں خصوصاً ان مذکورہ ممالک میں عورتوں کے خلاف تشدد کی چند شکلوں کے جواز (اور پھر ان کے لگاتار جاری رکھنے) کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے دلائل کا توڑ کرنے کیلئے مقامی نسخے بھی بتائے جائیں گے۔ یہ امر تسلیم کرتے ہوئے کہ ثقافت و مذہب، انفرادی اور اجتماعی شناخت کیلئے طاقتور اور مرکزی عنصر ہو سکتے ہیں اس کتابچے میں ارتکابِ جرم کرنے والوں کی بریت اور متبادل آراء کا گلا گھونٹنے کیلئے ان مباحث کے غلط استعمال پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ اگرچہ اس معلوماتی/ تعارفی کتابچے میں بنیادی طور پر مذکورہ آٹھ ممالک کا جائزہ لیا گیا ہے تاہم ''ثقافت

اور مذہب'' کے نام پر عورتوں پر تشدد کسی بھی طرح ان معاشروں یا مسلم اکثریتی اقوام تک محدود نہیں ہے۔ دنیا بھر کے مختلف علاقوں، ثقافتوں اور مذاہب میں اس مکروہ فعل کی ڈھیروں مثالیں مل جاتی ہیں تاہم چونکہ WRRC پروگرام کا مرکزِ نگاہ مسلم اکثریتی معاشرے ہیں اس لیے یہاں اسلام پر بحث کی جائے گی جو کہ ان اقوام کا مذہب ہے۔

حوالہ جات

1۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کا گہرا مطالعہ (2006): عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کے خاتمے (2007) کی کوششوں میں تیزی لانے بارے اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 143؛ عورتوں پر تشدد کے خاتمے کی اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی مہم (2008)۔

2۔ دیکھئے www.stop-killing.org

ثقافت اور مذہب

''ثقافت اور مذہب'' لازم وملزوم

اگرچہ ہماری بول چال اور کھانے پینے سے لے کر پہناوے تک روزمرہ زندگی کے ہر کام سے ثقافت کے مختلف پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ثقافت کی کوئی تعریف طے کرنا آسان کام نہیں ہے کیونکہ یہ ایک قیاسی اور ہمیشہ سے ارتقاء پذیر تصور ہے۔ عورتوں پر تشدد، اس کی وجوہات ونتائج بارے اقوامِ متحدہ کے سابق خصوصی ماہر یقین ارترک کا کہنا ہے کہ:

> ثقافت کسی انسان کے مشاہدے میں آنے والے ان مشترکہ روحانی، مادی، عقلی اور جذباتی خدوخال کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے جسے سماجی رسم ورواج کے دائرے میں تخلیق وتعمیر کیا جاتا ہے۔ ثقافت کا قریبی تعلق ان مختلف اطوار سے ہوتا ہے جن میں مختلف سماجی گروہ روزانہ اپنی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں وہ عمومی مفہوم بھی شامل ہوتا ہے جو روزمرہ کے معمولات کی بنیاد ہے اور وہ ہمعصر معنی بھی جو وقت کے ساتھ تبدیلی کی علامت ہوتے ہیں۔ (ارترک، 2007ء، صفحہ 8)

جیسا کہ اس تعریف سے واضح ہو رہا ہے کہ 'ثقافت' تجربے اور عمل کے طریقوں کے گہرے ملاپ کا نام ہے۔ اس لیے یہ کوئی جامد یا ناقابل تغیر چیز نہیں بلکہ ایک ایسا سیال مادہ ہے جو اپنے سیاق وسباق (جگہ، وقت، مقام، صنف، طبقہ وغیرہ) کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ثقافتی پس منظر میں بھی کئی ثقافتی تصورات موجزن ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثر جسے ایک ثقافت سمجھا جاتا ہے وہ درحقیقت اس ثقافت کے غالب (یا اجارہ دار) حصے کا اظہار ہوتا ہے۔ (فراحانی، 2007، شہید،

2008)۔ دوسرے لفظوں میں اکثر جسے ''مصدقہ ثقافت'' کہہ کر پیش کیا جاتا ہے خصوصاً جب زیرِ بحث مسئلہ عورتوں کے حقوق یا عورتوں پر تشدد سے متعلق ہو تو وہ دراصل ثقافت کے اجارہ داری والے حصے کا اظہار ہوتا ہے اور عورتیں اس ''ثقافت'' کے علامتی نشان کے طور پر دیکھی جاتی ہیں۔

اسی طرح مذہب کے مسئلے پر بھی ایسی ہی دلیل دی جاسکتی ہے کیونکہ اس کی تعریف متعین کرنا بھی اتنا ہی مشکل ہے۔ مذہب کی نوعیت اتنی پیچیدہ اور مختلف ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے امتیازی اوصاف یا عمومی علامات کی شناخت کر لی جائے (ایلاٹس 1977، صفحہ 214) نسبتاً یقین سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

> تمام معاشروں میں مذہب علاقائی ثقافت اور اپنے سے قبل یا بعد میں جذب کردہ روایات کا امتیازی نشان ہوتا ہے۔ ہر مذہب بالکل اسی طرح ایک ثقافتی ماحول میں نقش ہوتا ہے جیسے ہر ثقافت اپنی مذہبی سمت رکھتی ہے...اس لیے مذہب کو ثقافت یا رسوم و رواج سے الگ کرنا کسی حد تک مشکل ہوگا کیونکہ مذہب خود بھی ایک روایت، رواج یا ورثے میں ملنے والی چیز ہے۔ (ایمور، 2009، صفحہ 8)

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذہب میں کچھ مافوق الفطرت پہلو بھی ہوتے ہیں جیسے ایک اور دنیا کی قوت پر یقین اور اس کا خوف۔ تاہم اس مطالعہ میں مذہب اور ثقافت کے درمیان چولی دامن کا یہ تعلق (جس کی نشاندہی ایمور نے کی) ہونا ناگزیر ہے۔ واحد مستند تشریح کے پردے میں اجارہ دارانہ وضاحت کا جو عمل ثقافت کے تعین میں کارفرما نظر آتا ہے اس کا ویسا ہی اطلاق مذہب پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ کسی مذہب کے ''پیدائشی'' یا ''مستند'' کہے جانے والے اوصاف محض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن پر غالب گروہ زور دیتا ہے۔ اختلافی یا اقلیتی گروہ کی تشریحات اکثر کسی مذہب کی ''ضروری'' خصوصیات کے بارے میں کافی مختلف نقطۂ نظر پیش کر رہی ہوتی ہیں۔

ثقافت اور مذہب کے مابین تعلق کی اصطلاحات میں ہم مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عورتوں پر تشدد کو جواز مہیا کرنے کیلئے ثقافت اور مذہب دونوں ایک جیسی نوعیت کے حامل ہیں۔ یہاں تک کہ مذہب، ثقافت اور روایات ایسے تصورات ہیں جن کی متعلقہ مفادات کی روشنی میں تعریف اور دوبارہ تشریح کی جاسکتی اور استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ (وائٹن بیچ، 2008، صفحہ 229) یہ نہایت اہم نکتہ ہے۔ اگرچہ مذہب اور ثقافت دونوں آپس میں گندھے ہوتے ہیں مگر عورتوں پر تشدد کو جواز بخشنے میں دونوں کے درمیان تعلق کا انحصار ان کے مشترکہ خیالات سے کم اور اس حقیقت پہ زیادہ ہوتا ہے کہ پدرسری تشریحات کا اثر دونوں مساوی طور پر قبول کرتے ہیں۔ وہ افراد جو طاقت پر کنٹرول رکھنے کی وجہ سے قوت کے مقام پر ہیں۔

غالب ثقافت اور مذہب دونوں کی من پسند تشریح کرتے ہیں (شہید، 2008) کسی معاشرے میں طاقت کے تعلقات پر بات کیے بغیر عورتوں پر تشدد کے حوالے سے کسی ثقافت یا مذہب کی بات کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ اگرچہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مذہب کا مافوق الفطرت پہلو مذہبی دلائل پر اعتراض کو ثقافت پر مبنی دلائل سے مشکل بنا دیتا ہے (کیونکہ ثقافت ''انسانوں کی تشکیل کردہ'' ہوتی ہے اس لیے مقدس نہیں ہوتی) لیکن یہ مفروضہ کچھ حد تک غلط ہے۔ تاریخی تجربے خصوصاً نوآبادیاتی ورثے اور سامراجی نظام نے بھی ثقافت کو مقدس یا ناقابل اعتراض وادی میں دھکیل دیا ہے چونکہ زیرِ بحث اکثر معاشروں نے کسی نہ کسی حوالے سے استعمار کا سامنا کیا ہے اس لیے ''غیر ملکی مداخلت کے سامنے اپنی مستند ثقافت کو برقرار رکھنا'' طاقتور امر بھی ہے اور ہر جگہ عیاں بھی۔ جیسا کہ جنوبی ایشیاء میں تشدد کے ''رسوماتی رواجی'' معمولات بارے 2005 میں بات کرتے ہوئے تشدد کیخلاف سابق خصوصی ماہر رادھیکا کوماراسوامی نے کہا:

> ہماری رسومات پر بین الاقوامی تنقید کے جواب میں ہمارا مقامی ردعمل ملا جُلا ہوتا ہے کچھ کہتے ہیں کہ... ہمارے ثقافتی نظام کی اندرونی منطق کے ذریعے ان رسومات کو جواز مہیا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ ایسے رواجوں پر تنقید یا انہیں ختم کرنے کی کوشش نوآبادیاتی نظام اور مغربیت پسندی کے نخوت آمیز ورثے کا ایک حصہ ہے۔

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ ''مغربیت پسندی کا الزام بھی مکاری ہے کیونکہ ان میں سے کئی معاشرے تیزی سے عالمگیر بن رہے ہیں اور ثقافت کا سوال محض عورتوں کی محکومیت سے متعلقہ نظر آتا ہے۔'' یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ فیصلہ کہ کیا چیز ''مغربی'' ہے اور کیا ''دیسی'' ذاتی پسند و ناپسند اور غیر مستقل عمل پر مبنی ہے۔ ایک مشاہدہ کار کے الفاظ میں اسے کسی صورت قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے بہت سے آدمی دیکھے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے مفادات کے تابع ہو کر مرد و زن کے آزادانہ انتخاب کا احترام کیے بغیر جو چاہتے ہیں کاٹتے اور چپکاتے پھرتے ہیں۔ (فراحانی 2007، صفحہ 269)

''ثقافت اور مذہب'' کے نام پر عورتوں پر تشدد

عورتوں کیخلاف تشدد کے خاتمے کے اقوامِ متحدہ کے اعلامیے (1993) میں عورتوں پر تشدد کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے:

> صنفی بنیاد پر تشدد کا کوئی بھی ایسا فعل جو عورتوں کیلئے جسمانی، جنسی یا نفسیاتی نقصان یا مصیبت کا سبب بنے یا سبب بننے کا خدشہ ہو۔ اس میں کسی ایسے فعل کی دھمکی، جبر یا آزادی سے یک طرفہ محرومی بھی

شامل ہے۔ چاہے یہ فعل عوامی سطح پر انجام دیا گیا ہو یا نجی طور پر[3]۔

اگرچہ انسانی حقوق کا بین الاقوامی قانون مسلسل اس حوالے سے واضح ہوتا جا رہا ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے جواز میں ثقافت کو پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن (عوامی اور نجی دونوں سطحوں پر) عورتوں پر تشدد کے ذمہ دار اکثر ''ثقافت'' کے نام پر اپنے جرائم کی سزا سے بچ نکلتے ہیں یا پھر کم سزا پاتے ہیں۔ اس کے برعکس (جنسی اور ''اخلاقی'') ثقافتی روایات پامال کرنے والی خواتین کو مردوں کی نسبت زیادہ تشدد آمیز طریقوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس تشدد کو جائز قرار دینے کیلئے ثقافتی یا مذہبی دلائل کے غلط استعمال پر یہاں بحث کی جائے گی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ ان تصورات کو طاقت کے حصول یا اس پر کنٹرول برقرار رکھنے اور یوں سیاسی میدان میں داخلے کیلئے بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے اور اکثر انہیں درمیان میں اس وقت لایا جاتا ہے جب عورتوں کی محکومی کے مقام کا جواز پیش کرنا ہو:

> آج سیاسی اسلام اور مذہبی جنونیت پسندی کی دوسری اشکال کے ظہور اور نشر و اشاعت کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں عورتوں کو سنگسار کرنے اور دوسری اقسام کے ظالمانہ، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک میں اضافہ ہو رہا ہے... سیاسی اسلام کے رجحان کے ساتھ ساتھ مذہب اور ثقافت کے نام پر عورتوں کے جسموں پر بڑھتا ہوا کنٹرول پریشان کن ہے[4]۔

کچھ معاشروں میں ریاستی اور غیر ریاستی نظامِ انصاف پر ایسی قوتوں کا غلبہ ہے جن میں قدامت پرستی کے جراثیم پائے جاتے ہیں[5]۔ جو دعویٰ کرتی ہیں کہ ثقافت، رواج یا مذہب کے حوالے سے ان کی تشریح مستند ہے اور اکثر مذہبی و رسوماتی قوانین کا تنگ نظر اور بے لچک نفاذ چاہتی ہیں۔ ان معاشروں میں صنفی بنیاد پر امتیاز اور تشدد کے واقعات کو ''مذہب'' اور ''ثقافت'' کے نام پر روا رکھے جانے کی عام مثالیں ملتی ہیں[6]۔

جیسا کہ مختلف عالمی دانشور اور خواتین کے حقوق کی پیروی کرنے والوں کے مشاہدے میں آیا ہے کہ عورتوں کو اکثر ثقافت کی علامت، ''روایت'' کا مجسمہ اور ''ثقافتی صداقت[7]'' کا کردار سونپا جاتا ہے۔ اس طرح عورتوں کے جسم ثقافتی نظریہ اضافیت کے دلائل کا میدانِ جنگ بن چکے ہیں[8]۔ غیرت اور شرم کے ان تصورات کی بنیاد پر جب عورتوں پر تشدد کا جواز پیش کرنے کی کوشش میں ثقافت یا مذہب کا حوالہ دیا جاتا ہے تو انسانی حقوق کا بین الاقوامی نظامِ عہد صنفی بنیاد پر تشدد پر تنقید کرتے ہوئے گھبرا جاتا ہے۔ ان بین الاقوامی نمونوں اور معیار کے باوجود عالمی انسانی حقوق اور ثقافتی نظریۂ اضافیت کے درمیان تناؤ دنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں عورتوں کی زندگی میں روزانہ جاری و ساری ہے (کوماراسوامی، 2003، صفحہ 7)۔ عورتوں کی محکومیت اور ان پر

تشدد کا جواز پیش کرنے کیلئے ''ثقافت'' کے استعمال میں عمومی طریقہ کار مقدس تصورات اور انسانی حقوق کو اپنا مددگار بنانا ہے تاکہ پدرسری صنفی تعلقات کو برقرار رکھا جاسکے۔

یہاں زیر بحث تشدد سے عمومی مراد نجی دائرہ کار میں ہونے والا تشدد ہے جیسے خاندان میں یا برادری میں لیکن جیسا کہ کاک برن (2004) اور موذر (2001) نے کہا ہے کہ صنفی بنیاد پر تشدد ایک تسلسل کا نام ہے۔ تشدد گھر سے شروع ہوتا ہے اور سڑک پر، برادری میں، ملک اور برِاعظموں کے پار تک چلتا جاتا ہے۔ ان تمام مقامات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی برادری یا ریاست کے کردار کو گھر میں ہونے والے تشدد سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عورتوں پر تشدد کے واقعات میں کسی سزا یا خوف کی عدم موجودگی کی ''ثقافت'' کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ عورتوں پر تشدد کے ثقافتی جواز کے اظہار کی تشریح میں (اگلے حصے میں) وضاحت کی جائے گی کہ ایسے افعال صرف انفرادی سطح پر سرزد نہیں ہوتے۔ اجارہ دارانہ ثقافت کی پدرسری نوعیت تمام سطحوں پر عورتوں پر تشدد کے تسلسل کا جواز تلاش کرتی پائی جائے گی[9]۔

مسلح تصادم کی صورت میں ثقافتی جواز پر مبنی عورتوں کیخلاف تشدد

اگرچہ لڑائیوں کے دوران تشدد کے موضوع پر یہاں تفصیلاً بات نہیں کی جائے گی لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ثقافتی جواز رکھنے والا عورتوں پر تشدد امن کے دوران اور تصادم دونوں صورتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لڑائی کے دوران عورتوں پر جنسی تشدد ہمیشہ سے روایت رہی ہے لیکن اسے قلم بند کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش صرف حال ہی میں کی گئی ہے۔ جنگوں سے پہلے، ان کے دوران اور بعد میں عورتیں ریاستی اور غیر ریاستی عناصر کی طرف سے جسمانی، جنسی اور نفسیاتی تشدد کی تمام اشکال کا سامنا کرتی ہیں۔ جنسی تشدد میں زنا بالجبر، جنسی غلامی، جنسی استحصال، بے ارادہ گمشدگیاں، بلاوجہ قید، جبری شادی، جبری پیشہ کروانا، جبری اسقاطِ حمل، جبری حمل اور جبری برتھ کنٹرول شامل ہیں۔ عورتوں پر تشدد میں ریاستی افواج اور غیر ریاستی مسلح گروہ ملوث ہوتے ہیں۔ اس تشدد بارے احکامات دینے والے فوجی و سیاسی مقاصد کے تحت عمل کر رہے ہوتے ہیں جیسے جنگ کے ایک ہتھکنڈے کے طور پر، تشدد کی ایک شکل کے طور پر، زخمی کرنے کیلئے، معلومات اگلوانے کیلئے، بے عزت اور خوفزدہ کرنے کیلئے اور کمیونیٹیز کو تباہ کرنے کیلئے (باؤر اور ہیلی، 2006، چیلنڈی، 2008) عورتوں کو اکثر اپنا گھر بار چھوڑنے اور مہاجر کیمپوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ تصادم کے اثرات سرعام تشدد کے خاتمے کے بعد بھی دیر تک جاری رہتے ہیں۔ اس کا سب سے تباہ کن اثر کمیونیٹیز میں تشدد کو برداشت کرنے اور تشدد کی توقع کرنے میں اضافہ ہے۔

افغانستان

32 سال سے جاری افغان جنگ نے ملک کے بنیادی ڈھانچے کو تقریباً مکمل طور پر تباہ کر دیا ہے اور ملک کے اکثر حصوں سے نارمل عدالتی ڈھانچہ غائب ہو چکا ہے۔ اس کے نتیجے میں قانون کی حکمرانی غائب ہو چکی ہے اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا ہے جس میں مسلح گروہ اور حکومتی فوجی بلا کسی روک ٹوک کے عورتوں پر تشدد کر سکتے ہیں[10]۔ 2001 میں امریکی قبضے سے پہلے طالبان نے پشتون ولی کو انتہا پسند شکل میں نافذ کر رکھا تھا جس میں عورتوں کو شادی کے نام پر بیچنے اور ''غیرت'' کے نام پر ہونے والے جرائم کو جائز قرار دینے کے قوانین شامل تھے۔ تسلط کاروں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ کریں گے اور اسے فروغ دیں گے مگر عورتوں پر جنسی تشدد اسی طرح جاری و ساری ہے بلکہ جنسی زیادتی کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ کئی واقعات میں جنگی سرداروں نے خود جنسی زیادتی کرنے کا حکم دیا۔ یہ سردار عموماً سزا سے بچ نکلتے ہیں۔ حکومت شاذ و نادر ہی زیادتی کرنے والوں کیخلاف حرکت میں آتی ہے جبکہ زیادتی کیخلاف آواز بلند کرنے والی مظلوم عورت کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ اس کو بطور زانیہ سزا دی جا سکتی ہے[11]۔ گزشتہ چند برسوں میں افغان نظامِ قانون کی دوبارہ تعمیر کی کوشش کے باوجود قانون کی حکمرانی کابل سے باہر کہیں نظر نہیں آتی جس سے عورتیں مکمل طور پر عدمِ تحفظ کا شکار ہیں۔ باقاعدہ نظامِ انصاف کی جگہ ایک غیر رسمی قبائلی نظامِ انصاف یا جرگے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جوابدہی کے تصور اور باقاعدہ قانونی حاکمیت سے خالی یہ جرگے عموماً خاندانی جھگڑوں کو نمٹانے کیلئے جبری شادیاں یا عورتوں کو بدلے میں دینے جیسے فیصلے کرتے ہیں۔

حوالہ جات

3۔ http://www.unifem.org/attachments/213_chapter01.pdf

4۔ SKSW Concept Note: http://www.stop-stoning.org/concept

5۔ قدامت پسند سے یہاں مراد صرف وہی قوتیں نہیں ہیں جو تبدیلی کو مسترد کرتی ہیں یا ''روایت پسند'' ہیں بلکہ وہ بھی جن کا مخصوص سیاسی ایجنڈا ہوتا ہے جس کا مقصد ثقافت، مذہب یا سیاست کا ایک تنگ نظر، اجارہ دارانہ اور جابرانہ نظریہ نافذ کرنا ہوتا ہے جو کسی بھی قسم کی کثرتِ آراء یا اختلاف کو مسترد کرتا ہے۔

6۔ سیکرٹری جنرل کی رپورٹ (2006) ''عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کا گہرا مطالعہ'' میں کہا گیا ہے کہ ''ثقافتی روایت کے دفاع کا دعویٰ کرنے والی کچھ ریاستوں اور کئی ممالک میں سماجی گروہوں نے عورتوں کے حقوق پر پابندیاں لگاتے ہوئے ثقافتی جواز پیش کیے ہیں۔ اس دفاع کیلئے آواز عموماً سیاسی رہنماؤں یا روایتی حکام نے اٹھائی ہے نہ کہ انہوں نے جن کے حقوق دراصل متاثر ہوئے''۔

7۔ مثلاً ملاحظہ ہو کانڈی پوتی (1991)؛ کوماراسوامی (2003)، ارترک (2007)۔

8۔ ''ثقافتی نظریۂ اضافیت یہ عقیدہ ہے کہ ایسا کوئی عالمی قانونی یا اخلاقی معیار کہیں بھی موجود نہیں ہے جس کے مطابق انسانی اعمال کو پرکھا جا سکے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ انسانی حقوق کی بحث عالمی نہیں بلکہ یورپی روشن خیالی اور اس کی مخصوص ثقافتی ترقی کی پیداوار ہے اور دنیا کے ایک حصے کی ثقافت کے دوسرے حصے پر ٹھونسا جاتا ہے'' (کوماراسوامی، 2003)۔

9۔ بیوی پر تشدد، ماحول ریاست اور مذہبی نظریات کے گٹھ جوڑ اور جنسیت، صنف اور غیرت بارے اجارہ دارانہ ثقافتی توضیح سے پیدا ہوتا ہے۔'' (اڈروس اور بینیٹ 2003، صفحہ 38)

10۔ ''افغانستان: کوئی ہماری نہیں سنتا اور کوئی ہمیں انسان نہیں سمجھتا۔ عورتیں انصاف سے محروم'' از ایمنسٹی انٹرنیشنل
http://www.web.amnesty.org/library/index/engasa110232003

11۔ ''ہمارے لیے دنیا کے وعدے ہیں: افغانستان میں عورتوں کے حقوق''، (ہیومن رائٹس واچ 2009)، افغانستان کے حوالے سے جنگ زدہ علاقوں میں عورتوں پر تشدد بارے تفصیلی بحث۔

ثقافت اور مذہب کے نام پر

عورتوں کیخلاف تشدد کو جائز قرار دینے کی مختلف اشکال

درج ذیل حصہ مختصر طور پر عورتوں کیخلاف تشدد کی پائی جانے والی ان چند قسموں کو بیان کرتا ہے جنہیں زیرِ مطالعہ اُن آٹھ ملکوں میں ''ثقافت اور مذہب'' کے نام پر جائز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بتانی ضروری ہے کہ عورتوں کے خلاف تشدد کی کسی ملک میں درجنوں اقسام پائی جاسکتی ہیں مگر تحقیق اور جگہ کی کمی کے باعث ان میں سے تشدد کی صرف ایک یا دو شکلوں بارے ہی بات کی گئی ہے۔ ان مثالوں کو زیادہ تر متعلقہ ملک میں مقامی ساتھیوں کی طرف سے تحریری شکل میں اکٹھے کیے گئے مواد سے ہی لیا گیا ہے۔

غیرت کے نام پر قتل اور متعلقہ جرائم

'غیرت کے نام پر قتل'[12] میں اکثر کسی عورت کو اس وجہ سے قتل کر دیا جاتا ہے یا قتل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے[13] کہ خاندان یا برادری کی ''غیرت'' کو محفوظ کیا جاسکے یا دوبارہ حاصل کیا جاسکے۔ ''غیرت'' سے متعلق جرائم میں اسی طرح کا عمل ہوتا ہے لیکن اس میں لازماً نہیں کہ بات قتل تک جائے۔ اس میں جسمانی یا ذہنی زیادتی یا جبری شادی ہوسکتی ہے۔ خصوصی ماہر نے اس کی تعریف یوں کی:

> غیرت کی تعریف روایتی خاندانی تصور کے تحت عورتوں کو دیئے گئے جنسی اور نسوانی کرداروں کی

> اصطلاحات کی روشنی میں طے کی جاتی ہے۔ پس شوہر کے علاوہ جنسی تعلق، شادی سے پہلے تعلقات (اس میں جنسی تعلق بھی شامل ہو یا نہ ہو)، زنا اور کسی ''ناموزوں'' شخص کے ساتھ محبت کرنے سے خاندان کی غیرت پر حرف آ سکتا ہے۔ (کومارا سوامی، 1999)

اگر کوئی عورت اس ''اخلاقی'' حد کو پار کرتی ہے یا سمجھا جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے تو کمیونٹی کے سامنے خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے۔ خاندان کی غیرت کی بحالی کیلئے عورت کی جان کی بھی قربانی دی جاسکتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کے فنڈ برائے آبادی کے اندازے کے مطابق ہر سال تقریباً پانچ ہزار عورتیں اور لڑکیاں غیرت سے متعلقہ تشدد کے نتیجے میں موت کے گھاٹ اتار دی جاتی ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے قتل اکثر مسلمان معاشروں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن یہ فرض کر لینا غلط ہوگا کہ غیرت کے نام پر قتل محض مسلمان ثقافت یا معاشروں کی خاصیت ہے۔ درحقیقت اس طرز کا عورتوں پر تشدد اٹلی اور لاطینی امریکہ جیسے مختلف ثقافتی اور مذہبی معاشروں میں عام رہا ہے[14]۔

ایسا تشدد (جسے درست طور پر ماورائے عدالت قتل کہا جا سکتا ہے[15]) بلاشبہ انسانی حقوق اور قانون کے کئی معیارات کی براہ راست خلاف ورزی ہے۔ لیکن چونکہ ریاستی اور غیر ریاستی عناصر (یا دونوں ہی) ثقافت یا مذہب کے نام پر ایسا تشدد کرتے ہیں یا اس کی اجازت دیتے ہیں اس لیے غیرت کے نام پر قتل کو روکنا مشکل امر رہا ہے۔

کئی مسلمان علماء غیرت کے نام پر قتل کو غیر اسلامی کہہ چکے ہیں[16]۔ لیکن ابھی بھی کچھ لوگ اسے ''اسلامی'' اور عام طور پر ''ثقافتی'' معمول قرار دے کر اس کا جواز مہیا کرتے ہیں۔

پاکستان

اس موضوع پر بحث کیلئے دنیا بھر میں غیرت کے نام پر قتل کی سب سے اونچی شرح رکھنے کی وجہ سے پاکستان، اہم مقام ہے۔ ایسے افعال (جنہیں کاروکاری کہا جاتا ہے) کیلئے سماجی رضامندی کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ غیرت کے نام پر قتل کے مجرموں کو کم ہی انصاف کے کٹہرے تک لایا گیا ہے۔ کچھ قبائلی جرگوں کے مطابق[17] کسی عورت کو غیرت کے نام پر قتل کرنا کسی صورت جرم نہیں بنتا بلکہ مجرم اور اس کے خاندان کو متاثرہ فریق سمجھا جاتا ہے (پی ڈی آئی، 2005) پاکستانی نظام قانون اگرچہ کھل کر قتل غیرت کی حمایت نہیں کرتا تاہم ایسے جرائم کے مرتکب افراد کیلئے وہ ہمدردی رکھتا ہے۔ غیرت کے نام پر جرائم کے مرتکب افراد پر مقدمہ چلانے کا عمل تکلیف دہ حد تک لمبا ہوتا ہے اور اکثر مجرموں کو رہائی یا معمولی سزا ملتی ہے (حسین، 2006)۔ 2005 میں غیرت کے نام پر قتل کیخلاف قانون پاس ہوا۔ یہ پہلی قانون سازی تھی جس میں صاف طور پر غیرت کے نام پر ہونے والے قتل تسلیم کیے گئے اور ایسے جرائم پر سزا میں نمایاں اضافہ کیا گیا تاہم یہ قانون قصاص و دیت آرڈیننس کو ختم یا بدلنے میں ناکام ہوا جو مظلومہ یا اس کے خاندان کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ غیرت کے نام پر جرائم مرتکب کرنے والوں کو معاف کر دیں اور یوں مجرم سزا سے بچ نکلتے ہیں[18] چونکہ اکثر حالات میں مظلومہ کا خاندان ہی مجرم کا خاندان بھی ہوتا ہے اس لیے یہ آرڈیننس غیرت سے متعلق تشدد کے مجرموں کی برّیت کا سامان پیدا کرتا ہے۔

ایران

ایرانی معاشرے میں بھی غیرت سے متعلقہ تشدد سرایت کر چکا ہے اور اکثر عورتوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ خود کو جلا کر مار ڈالیں[19] پھر ان واقعات کو خودکشی کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے جرائم خصوصاً ایلام اور خوزستان کے صوبوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ 2003 میں صرف ایک ہی قبیلے میں ایسے 45 واقعات ہوئے جن میں مظلوم عورتیں کی عمریں 20 سے بھی کم تھیں۔ 2001 میں کل 565 عورتوں نے ''غیرت'' سے متعلقہ جرائم میں اپنی جانیں ہار دیں۔ ان میں سے 367 واقعات کو خود کو جلا لینے کے واقعہ کے طور پر پیش کیا گیا (ارترک، 2006) ان عورتوں کی بدقسمتی ہے کہ ایران کے نام نہاد ''اسلامی'' قوانین ایسے قتلوں کی اجازت دیتے ہیں۔ ایران کی اسلامی تعزیرات کی شق نمبر 630 مرد کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو زنا بالرضا کرتے دیکھ کر انہیں قتل کر سکتا ہے[20]۔ اور اگر زنا بالجبر ہو رہا ہو تو شوہر صرف دست درازی کرنے والے شخص کو قتل کر سکتا ہے (ظہور، 2009) اگرچہ ''غیرت'' کا یہاں واضح ذکر نہیں کیا گیا لیکن غیرت اور شرم کے تصورات ان قوانین کے پیچھے سے واضح طور پر جھلک رہے ہیں۔

جبری ازدواجی تعلق

عالمی مہم برائے ''عورتوں کا قتل اور سنگساری کا خاتمہ'' کے زیر مطالعہ ممالک سمیت بہت سارے ملکوں میں جبری ازدواجی تعلق کو قانوناً جرم قرار نہیں دیا گیا[21]۔ دنیا بھر کے بے شمار گھروں میں پدرسری ضابطۂ اخلاق کے تحت کام کرنے والی ''ثقافتی'' روایات عورتوں کی جنسیت کو شادی کے اندر کنٹرول کرتی ہیں اور عورتوں پر یہ زور دیتی ہیں کہ وہ اپنے شوہروں کے جنسی مطالبات کو پورا کریں۔ علاوہ ازیں ''کچھ مذہبی اداروں کی یہ تاکید کہ عورتوں کا اپنے شوہر کے ساتھ ہم بستر ہونے سے انکار باعث گناہ ہے، جبری ازدواجی تعلق کا مسئلہ پیدا کرتی ہے'' (کینیڈی برجن، 1999، صفحہ 6 تا 7)

عورتوں کی جنسیت کو اکثر شوہروں کی امانت سمجھا جاتا ہے اور جنسی مباشرت کا انحصار بیویوں کی واضح رضامندی پر نہیں ہوتا۔ شادی ایسا بندھن ہے جو عورتوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی جنسی ضروریات کو پورا کریں[22]۔ اگرچہ اس حوالے سے اعداد و شمار کا حصول ایک مشکل امر ہے تاہم جبری ازدواجی تعلق دنیا بھر میں ثقافتی جواز کے ساتھ عورتوں پر تشدد کی بلاشبہ ایک بے ضابطہ اور عالمگیر شکل ہے۔

افغانستان

اسی طرح افغانستان میں بھی جبری ازدواجی تعلق سماجی طور پر قابل قبول روایت بن چکی ہے (ارترک، 2003)۔ شیعہ افغان عائلی قانون جس کی صدر کرزئی نے 2009 میں منظوری دی، میں جبری ازدواجی تعلق کو تقریباً قانونی شکل دے دی گئی ہے۔ اگرچہ بل کے حتمی ڈرافٹ میں سے اصل فقرے کو ختم کر دیا گیا تھا جس کے تحت بیوی کیلئے اپنے شوہر کے ساتھ کم از کم ہر چوتھے دن ہم بستری کرنا لازمی تھا لیکن بل میں ابھی بھی شوہر کو اجازت دی گئی ہے کہ اگر بیوی اس کی جنسی خواہش کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے تو وہ خوراک سمیت اس کو بنیادی ضروریات کی فراہمی بند کر سکتا ہے[23]۔

افغان عورتوں نے اس قانون کے خلاف سڑکوں پر آ کر احتجاج کیا تو قانون سازوں کو یہ معمولی سی اصلاح کرنا پڑی۔ پارلیمنٹ میں سخت گیر شیعہ علماء کے تیار کردہ اس بل کو ''اسلام کی سچی تعلیمات'' کے مطابق قرار دیا گیا۔

انڈونیشیاء

انڈونیشیا کے فوجداری قانون میں جبری ازدواجی تعلق کو جرم نہیں سمجھا جاتا۔ اس قانون کے مطابق آبروریزی کا فعل صرف ان افراد کے مابین پایا جاسکتا ہے جو ایک دوسرے کے نکاح میں نہ ہوں[24]۔ اس کے علاوہ 2009 میں صوبہ آچے میں پاس کردہ نئے قانون فوجداری میں جبری ازدواجی تعلق کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہے[25]۔ ان قوانین کو اکثر ثقافتی اور مذہبی بنیادوں پر جائز قرار دیا جاتا ہے:

> مذہب اور ریاستی نظریہ میں عورتوں کے محکوم مقام کو جواز بخشنے کیلئے نظریۂ قدرت (عورتوں کی ''فطرت'' یا قسمت کی طرف اشارہ) کو سامنے لایا جاتا ہے تاکہ صنفی عدم مساوات کو فطری کہا جاسکے۔ ریاستی اور مذہبی خطابت کی معروف تشریحات میں ''خاوند کی پیروی کرو'' کا فقرہ بار بار سننے کو ملتا ہے جس کا مقصد عورتوں کو مناسب صنفی کردار اور تعلقات کیلئے ہدایات دینا اور عورتوں کی محکومیت کو فطری بنانے کی کوشش کرنا ہوتا ہے (اڈرس اور بینیٹ، 2003، صفحہ 44)

ریاست پدرسری مذہبی اور ثقافتی دلائل کو چیلنج کرنے کا ارادہ نہیں کرتی جسکی وجہ سے جبری ازدواجی تعلق کا مسئلہ غالب مذہبی نظریے اور قانون میں دب جاتا ہے اور بیوی کے ہم بستری سے انکار کو گناہ سمجھا جاتا ہے (اڈرس اور بینیٹ، 2003) اگرچہ ازدواجی جنسی تعلقات کے حوالے سے احادیث کی گئی ترقی پسندانہ تشریحات بھی موجود ہیں[26]۔ لیکن انڈونیشیا میں غالب تشریح یہ کہتی ہے کہ اسلام کے مطابق جبری ازدواجی تعلق ایک ناممکنہ بات ہے۔ عورت کے اپنے جسم کی سلامتی کے حق کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

سنگساری

سنگسار کرنا[27] سزائے موت کا ایک طریقہ ہے جس میں کچھ لوگ اس شخص کو پتھر یا کنکر مارتے ہیں جس کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے۔ آج سنگساری کی سزا زیادہ تر مسلم معاشروں میں شادی شدہ زانی مرد اور زانیہ عورت کیلئے دیکھنے میں آتی ہے اگرچہ قرآن میں سنگساری کے حوالے سے کوئی حکم نہیں ملتا[28]۔ اس مفروضے کی بنا پر کہ سنگساری سزا کی ''اسلامی'' شکل ہے اس پر (ریاستی اور غیر ریاستی دونوں عناصر کی طرف سے) افغانستان، ایران، نائیجیریا، پاکستان، سوڈان اور صومالیہ میں عمل کیا جاتا ہے[29]۔ انڈونیشیا کے صوبے آچے میں حال ہی میں ایک بل لایا گیا ہے جس میں سنگساری کی سزا تجویز کی گئی ہے اور اس تحریر کے وقت قانون ساز اس پر غور وخوض کر رہے ہیں۔

ایران

ایران سنگساری کی سزا نافذ کرنے والے ممالک میں نمایاں ترین مثال ہے اور عالمی توجہ کا مرکز ہے۔ اس سزا کے خلاف ایک مضبوط تحریک چل رہی ہے۔ ایران کی اسلامی تعزیرات میں سنگساری کو زنا میں ملوث شادی شدہ لوگوں کیلئے سزا کے طور پر تجویز کیا گیا ہے۔

اس قانون کے تقاضوں کے مطابق عورت کو کندھوں تک زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے اور پھر چاروں طرف کھڑے ہجوم کی طرف سے اس کو پتھر مارے جاتے ہیں جو نہ بڑے ہوتے ہیں اور نہ بہت چھوٹے لیکن اس سائز کے ہوتے ہیں کہ رفتہ رفتہ موت کے گھاٹ اتار سکیں (شق نمبر 102)۔ سنگساری کی سزاؤں میں گواہی کے تقاضوں بارے اسلامی تعزیرات بہت واضح ہیں۔ شادی شدہ لوگوں کے زنا میں ملوث ہونے کو گواہوں کے ذریعے ثابت کرنا نہایت مشکل ہے لیکن ثابت کرنیکی اس ذمہ داری کو کم ہی ادا کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعزیرات کی شق نمبر 105 جج کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ شادی شدہ زانیوں کے مقدمے میں اپنی صوابدید سے کام لے سکے یعنی کوئی جج پیش کی جانے والی گواہی کے بجائے اپنے ''علم'' کی بنیاد پر (یا دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے) فیصلہ دے سکتا ہے (صدر، 2006)

شدید عالمی دباؤ کے نتیجے میں ایرانی عدلیہ کے سربراہ نے 2002 میں سنگساری کے عمل پر عارضی پابندی عائد کر دی تاہم 2005 میں محمود احمدی نژاد کی انتخابات میں کامیابی کے بعد سے سنگسار کرنے کے واقعات میں اضافہ نوٹ کیا جا رہا ہے۔ اسلامی تعزیرات میں سنگساری کی سزا مرد و زن دونوں کو دی جاتی ہے لیکن عورتوں کے شوہر کے علاوہ دوسرے مردوں سے تعلقات رکھنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ عائلی قوانین مرد کو تو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنی مستقل اور واحد شادی کے دائرے سے باہر جنسی تعلق استوار کر سکتا ہے مگر عورت کو نہیں۔ اس لیے عورتوں پر اس قانون کے جاری کیے جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں[30]۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سنگساری انسانی حقوق کی کئی روایات کو پامال کرتی ہے (اس میں زندہ رہنے اور تشدد سے آزادی کا بنیادی حق بھی شامل ہے) بڑے بڑے کئی علماء[31] اس فعل کی مخالفت کرتے ہیں اور قرآن میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں مگر سنگساری مسلسل ایرانی قانون میں شامل ہے اور اسے اسلام کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔

کوڑے مارنا

کوڑے (درے، چھڑیاں یا بید) مارنا بھی سنگساری کے بہت قریب ہے کیونکہ یہ بھی جسمانی سزا ہے جسے زنا کرنے پر لاگو کیا جاتا ہے اور اسے اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے[32]۔ یہ سزا افغانستان، انڈونیشیا، ایران، نائیجیریا، پاکستان اور سوڈان کے شرعی قوانین میں شامل ہے۔ قرآن میں زنا کی سزا 100 کوڑے بیان کی گئی ہے۔ (سورۃ النساء 43، آیات 15 تا 16) سزا دیتے وقت یہ خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ چوٹ نہ لگ جائے تاہم زیر بحث کئی معاشروں میں ''غیر اخلاقی رویے'' پر بھی کوڑے مارے جاتے ہیں۔ ان میں ایران، انڈونیشیا اور سوڈان شامل ہیں۔ ان قوانین کا واضح مقصد عورتوں کی جنسیت کو کنٹرول کرنا ہے[33]۔

سوڈان

سوڈان میں 1991 کے فوجداری ایکٹ کی شق نمبر 146 کے مطابق زنا میں ملوث غیر شادی شدہ ملزموں کو 100 کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے چونکہ سوڈانی قوانین کے تحت زنا بالجبر کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے اس لیے مظلوم عورت کو بھی ملزمہ گردان کر کوڑوں کی سزا دیا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے[34]۔ اکثر اوقات آبروریزی کا شکار ہونے والی عورت کو ریاست تحفظ فراہم کرنے کے بجائے اس پر زنا کا الزام لگا کر کوڑے مارتی ہے[35]۔

علاوہ ازیں امن عامہ کا قانون (1996) جسے 2009 میں بدل کر ضابطہ برائے تحفظ معاشرہ بنا دیا گیا، میں ان تمام جرائم (جنہیں اوصاف کے خلاف کہا جاتا ہے) کی فہرست دی گئی ہے جن کی سزا کوڑے مارنا ہے اور ان کا اطلاق صرف عورتوں اور لڑکیوں پر ہوتا ہے۔ ان میں سر کے بالوں کو ننگا چھوڑنا، پینٹ پہننا یا عوامی جگہوں پر غیر مرد کے ساتھ پایا جانا شامل ہے۔ ان صورتوں میں ضابطہ اخلاق نافذ کرنے والی پولیس عورتوں کو پکڑ لیتی ہے اور سرسری سماعت کے بعد انہیں اس الزام کا دفاع کرنے کا مناسب موقع دیئے بغیر کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے (بنی گربودل اور بورقے مارٹگنونی، 2003) ان واقعات پر عوامی توجہ اس وقت مرکوز ہوئی جب 2009 میں لبنیٰ احمد حسین کا مقدمہ سامنے آیا۔ ''طرزِ لباس'' کی خلاف ورزی پر لبنیٰ نے اپنے خلاف مقدمے اور ممکنہ کوڑوں کی سزا کی کافی تشہیر کی تھی[36]۔

انڈونیشیاء

انڈونیشیا کے جنوبی سلاویسی کی بولوکمبا ریجنسی میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی کمیٹی (KPPSI) کی طرف سے ''مسلم گاؤں کا منصوبہ'' زیرِ نفاذ ہے۔ مذہب کی آڑ میں اس منصوبے میں گاؤں کے بڑوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ عورتوں کے ''اخلاقی رویے'' کو درست رکھنے کیلئے سخت قوانین مثلاً کوڑوں کا قانون نافذ کریں جس میں زنا کے مرتکب افراد کو کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ،

> نظامِ انصاف میں جرم ثابت ہونے سے پہلے بے گناہی کے مفروضے کے اصول کی پابندی کی وجہ سے ان ضابطوں کے تحت خود عورتیں... قانونی کارروائی (قذف) کی زد میں آ سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان علاقائی اور دیہی ضابطوں کی تشکیل کے بارے میں عورتوں کو بتایا تک نہیں گیا۔ (مسلم معاشروں میں عورتوں کو بااختیار بنانا (WEMC) اور سولیڈیریٹاس پیری پون، 2009، صفحہ 2)

یہ ضابطے اور قوانین نہ صرف مذہب کے نام پر عورتوں پر تشدد کی توثیق کرتے اور مجاز بناتے ہیں بلکہ ان کے نفاذ بارے پیشگی خبردار کیے بغیر سب سے زیادہ غیر محفوظ طبقے (عورتوں) کو جال میں پھانستے ہیں۔[37]

جبری شادی

جبری شادیوں بارے ورکنگ گروپ 'حق انتخاب' (A Choice by Right) کے مطابق: جبری شادی ''ایک ایسی شادی ہے جس میں دونوں فریقین سے باقاعدہ رضامندی حاصل نہ کی گئی ہو اور اس میں جبر کا عنصر پایا جائے۔ یہ بین الاقوامی مسلمہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے[38] اور مذہبی یا ثقافتی بنیادوں پر اس کو جواز نہیں بخشا جا سکتا'' (جبری شادیوں پر ورکنگ گروپ، 2000، صفحہ 6)۔[39] برطانیہ کی تنظیم ساؤتھ ہال بلیک سسٹرز کا کہنا ہے کہ جبری شادی ''بنیادی طور پر نسوانی جنسیت اور خودمختاری سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی 'جنسی پاکیزگی' کا اظہار خاندان کی غیرت میں ہوتا ہے۔'' (2001، صفحہ 5)۔ بچپن میں یا جبری شادی کا دستور اکثر گھروں میں عورتوں پر تشدد کی دوسری اشکال تک لے جاتا ہے۔

جبری شادی کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جیسے معاشی لالچ یعنی رقم یا اشیاء کے بدلے میں لڑکیوں کا نکاح میں دیا جانا۔ صلح کیلئے یعنی کسی جھگڑے کو نمٹانے کیلئے عورتوں یا لڑکیوں کو کسی دوسرے خاندان کے حوالے کرنا۔ خاندانی ''غیرت'' کے تحفظ کیلئے یعنی وہ عورتیں جو زنا بالجبر کا نشانہ بنتی ہیں انہیں بعض اوقات زنا کار کے ساتھ ہی شادی پر مجبور کیا جاتا ہے تاکہ رشتے داروں کی

''غیرت'' قائم رہے (ارترک، 2007، جبری شادیوں بارے ورکنگ گروپ، 2000)۔ جبری شادیوں کے واقعات دوسرے ممالک کے علاوہ افغانستان، انڈونیشیا، ایران، پاکستان اور سوڈان میں بھی احاطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ ان تمام توجیہات کی جڑیں اس تصور سے پھوٹتی ہیں کہ لڑکیاں جائیداد کی طرح تبادلے کی چیزیں اور یہ کہ نسوانی رویے اور جنسیت پر کنٹرول قائم رہنا چاہیے۔ ان تصورات کو اکثر سماجی طور پر تسلیم شدہ رواجوں سے شہ ملتی ہے۔

افغانستان

افغانستان اس حوالے سے بہت نمایاں مثال ہے کیونکہ آزاد افغان انسانی حقوق کمیٹی (AIHRC) کے مطابق افغانستان میں 60 سے 80 فیصد شادیاں زبردستی کی جاتی ہیں (ارترک، 2007) دلہن کی قیمت لینا، وَنی کرنا اور بیوہ کی دوبارہ زبردستی شادی وغیرہ عام رسومات ہیں۔ وَنی کی رسم جھگڑے نمٹانے کیلئے ہوتی ہے جس میں ایک خاندان بدلے میں کوئی عورت یا لڑکی دوسرے خاندان کے ''حوالے'' کرتا ہے۔ یہ فعل اکثر مقامی جرگہ[40] کے حکم پر انجام دیا جاتا ہے۔ قرضہ اتارنے یا خاندان کی غربت کو کم کرنے کیلئے بھی نوعمر لڑکیوں کو بطور بیوی بیچا جاتا ہے:

> یہ جابرانہ فعل جزوی طور پر اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کو مالی اثاثے سمجھا جاتا ہے اور ان کے خاندان والے دولہا کے خاندان سے شادی کے موقع پر قیمت وصول کرتے ہیں... اس سے عورتوں کی زندگیوں پر ان کے شوہروں اور دوسرے مرد رشتے داروں کے کنٹرول کی بھی جھلک نظر آتی ہے (ایمنسٹی انٹرنیشنل، 2003، صفحہ 14)

انسانی حقوق کی تنظیموں نے وَنی کی رسم کو بھی انسانوں کی خرید و فروخت کی ''سماجی طور پر قبول شدہ'' روایت کے طور پر بیان کیا ہے[41]۔ یقین ارترک مزید کہتی ہیں کہ بیواؤں کو اکثر دوبارہ شادی (عموماً مرحوم خاوند کے کسی بھائی کے ساتھ) پر مجبور کیا جاتا ہے اور ان کی جائیداد ضبط کر لی جاتی ہے کیونکہ بیوہ کو اس کے سابق خاوند کے خاندان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ایسے افعال ان عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں جو غلامی، امتیاز، ظلم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک پر پابندی عائد کرتے ہیں مگر افغان حکومت نے صحیح معنوں میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جو ان افعال کو روک سکے اور یہ ایسے رواج ہیں جنہیں ریاستی قانون کی پشت پناہی حاصل ہے۔

حوالہ جات

12۔ یاد رہے کہ ''غیرت'' کے نام پر قتل/ جرائم کی اصطلاح متنازعہ ترین ہے۔ بمطابق روشیل ٹرمین (2010) اکثر میڈیا اور عوامی مباحث میں اس اصطلاح کو غلط استعمال کیا جاتا ہے جس سے مسلمان اور مہاجرین قومیں مزید دوری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ بمطابق ویلچمین اور حسین (2005 صفحہ 4) ''عزت کے نام پر جرائم کی اصطلاح سادہ نہیں ہے اور اسے احتیاط سے مختلف معنوں میں استعمال کرنا چاہیے۔

13۔ واضح رہے کہ کئی مردوں کو بھی ''غیرت'' کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں اس حوالے سے ہونے والے قتلوں میں سے نصف تعداد مردوں کی ہے۔

14۔ لاطینی اور جنوبی امریکہ میں غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم بارے مزید معلومات کیلئے (UNICAMP) مرکز برائے صنفی مطالعہ جات (2006) دیکھئے۔

15۔ جیسا کہ ماورائے عدالت، سرسری سماعت یا بے قاعدہ پھانسیوں بارے سابق خصوصی ماہر عاصمہ جہانگیر نے کہا (1999) دیکھئے:
http://www.extrajudicialexecutions.org/reports/E_CN_4_1999_39.pdf.

16۔ شیخ محمد علی الحجوطی، شیخ احمد کٹی اور شیخ عطیہ صقر جو کہتے ہیں کہ اسلام میں قتل غیرت کا ایسا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام ایسے افعال کی اجازت نہیں دیتا اور فی الحقیقت ان سے منع کرتا ہے۔ دیکھئے
http://www.islamonline.net/servlet/Satellite?pagename=IslamOnline-English-Ask_Scholar/FatwaE/FatwaE&cid=1119503543392

17۔ ریاستی قانون یا پولیس کے برعکس بزرگ مردوں کی روایتی فیصلہ ساز کمیٹی اکثر دیہی علاقوں میں فوجداری مقدمے سُنتی اور فیصلے کرتی ہے۔ ''جرگوں کے ذریعے فیصلہ سازی کا مقصد مسلمہ روایتی رواج کے مطابق بستی میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یہ رواج اکثر پدرسری نظام پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں عورتوں اور نوعمروں کے حوالے سے امتیاز برتا جاتا ہے'' (ارتک، 2003، صفحہ 6)۔

18۔ قبائلی قوانین پر تفصیلی بحث کیلئے دوسری تالیفات کے علاوہ درج ذیل کا مطالعہ مفید ہے حسین (2006)؛ عرفان (2008)؛ خود سین (2004)۔

19۔ افغانستان میں غیرت کے نام پر قتل کی یہ شکل پائی جاتی ہے۔ دیکھئے ارتک (2003)

20۔ یعنی شادی شدہ عورت کا غیر مرد سے جنسی تعلق۔ زنا بارے مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو زیبا میر حسینی اور ٹرمین اور فجابی کی تالیفات۔

21۔ جبری ازدواجی تعلق کا مسئلہ تمام زیر مطالعہ ممالک میں پایا جاتا ہے اور حال ہی میں چند مغربی ریاستوں کے لیگل فریم ورک میں بھی اس پر توجہ دی گئی ہے۔

22۔ معاشرہ اس تشدد کی توثیق اس تصور کو آگے بڑھا کر کرتا ہے کہ شادی ایک جنسی معاہدہ ہے جس میں مردوں کو اپنی بیویوں کے ''بدن'' پر بلا شرکت غیرے حق حاصل ہو جاتا ہے (اڈروس اور بینیٹ 2003، صفحہ 50)۔

23۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے: http://www.wluml.org/node/5465

24۔ یہ مسئلہ کئی ملکوں میں ہے کہ آبروریزی کی تعریف کا اطلاق صرف غیر شادی شدہ فریقین پر ہوتا ہے۔

25۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے: http://www.wluml.org/node/5796

26۔ بمطابق مسعودی (1997) مرد کیلئے گناہ کی بات ہے کہ وہ خود کو جبر سے بیوی پر لادے کیونکہ وہ ''معاشرہ بالمعروف'' کی خلاف ورزی کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی پناہ میں آنیوالے ہر شخص کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔

27۔ سنگساری پر مزید جامع بحث کیلئے ملاحظہ کریں ٹرمین اور فجابی کا اختصاریہ ''سنگساری ہماری ثقافت نہیں: ایران اور نائجیریا میں انسانی حقوق اور مذہبی مباحثوں کا تقابلی تجزیہ''

28۔ قرآن میں زنا کیلئے سزا صرف کوڑے یا درّے مارنا اور دیس نکالا دینے کی ہے۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ سزا اسلام میں ایک خاص حدیث پر مبنی ہے۔ زنا آرڈیننس پر تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے زیبا میر حسینی کا اختصاریہ، اور ٹرمین اور فجابی (صفحہ 8-14)۔

29۔ ایران اور نائجیریا بارے تفصیلی مطالعہ کیلئے دیکھئے ٹرمین اور فجابی کا اختصاریہ (صفحہ 22-28)۔

30۔ ایرانی عائلی قوانین کس طرح مرد کی طرفداری کرتے ہیں اور کس طرح یہ شادی شدہ زانیوں کیخلاف قوانین کو متاثر کرتے ہیں، کی وضاحت کیلئے دیکھئے ٹرمین اور فجابی۔

31۔ مثلاً آیت اللہ منتظری کی طرف سے سنگساری کی مذمت کیلئے دیکھئے: http://www.stopstoning.net/spip.php?article4 ایران میں سنگساری کی مذہبی علماء کی طرف سے مخالفت کے مزید واقعات کیلئے دیکھئے ٹرمین اور فجابی۔

32۔ اگرچہ اس معاملے میں قرآن میں کوڑے مارے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

33۔ ''عورتوں کو شوہر کے علاوہ جنسی تعلقات رکھنے جیسے جنسی اور اخلاقی رویے سے متعلقہ حدود کے جرائم میں غیر متناسب طور پر ملزم قرار دیا جاتا ہے جسکے نتیجے میں انہیں سنگین نتائج بھگتنے پڑتے ہیں... جب عورتوں پر ان جرائم میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے تو نظام انصاف میں پائے جانے والے اضافی امتیازی قوانین کی وجہ سے اکثر وہ اسکی تردید بھی نہیں کر پاتیں'' (ارتک، 2006، صفحہ 15)

34۔ حدود آرڈیننس نافذ کرنے والی کئی اقوام میں یہ بات درست ہے۔ ثبوت کے حوالے سے زنا بالجبر کو اکثر زنا بالرضا کی مثل سمجھا جاتا ہے۔ یعنی یا تو چار عینی شاہدین ہوں یا پھر ملزم خود جرم کا اعتراف کرے۔ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی نہ ہو تو مدعی عورت کو اکثر زنا کا اعتراف کرنے یا غلط الزام (قذف) لگانے کا مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔

35۔ سوڈانی قانون عورت پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اسے جنسی زیادتی کا شکار کیا گیا ہے لیکن حمل ٹھہرنے کو زنا کا ''اعتراف'' اور نا قابل تردید ثبوت قرار دیتا ہے۔ زنا بالجبر کی تصدیق کیلئے گواہوں کی تعداد پوری نہ ہونے کی صورت میں زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کو ہی زنا بالرضا کا مجرم قرار دے کر سزا سنادی جاتی ہے۔'' (تشدد کیخلاف سوڈانی تنظیم SOAT، 2006، صفحہ 65)

36۔ اس مقدمے بارے مزید تفصیلات کیلئے دیکھئے خواتین زیر اثر مسلم قوانین اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی کمیٹی برائے عورتوں کا مقام کو دی گئی رپورٹ: http://www.wluml.org/node/5517

37۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے مسلم معاشروں میں عورتوں کو بااختیار بنانا (WEMC) اور سولیڈیریٹاس پیریم پوآن (2009)۔

38۔ خواتین کیخلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کے کنونشن کی شق نمبر 16 یہ کہتی ہے کہ: ''فریق ریاستیں شادی اور خاندانی تعلقات سے متعلق تمام معاملات میں عورتوں کیخلاف امتیاز کے خاتمے کیلئے تمام مناسب اقدامات کریں گی اور خصوصاً مرد و عورت کی برابری کی بنیاد پر یہ یقینی بنائیں گی دیکھئے
http://www.un.org/womenwatch/daw/cedaw/text/econvention.htm#article16.

39۔ یاد رہے کہ جبری شادیاں خاندان کی طے کردہ شادیوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ جس طرح تھامس (2009) نے نشاندہی کی ہے کہ: جبری شادیوں میں ایک یا زیادہ فریق اپنے شریک حیات کے انتخاب کا حق کھو دیتے ہیں۔ طے شدہ شادیوں میں والدین اور خاندان رشتہ طے کروانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں مگر آخری فیصلہ لڑکی اور لڑکے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کئی لوگ طے شدہ شادیوں کا ایک مسلمہ ثقافتی روایت کے طور پر احترام کرتے ہیں جو کہ کئی برادریوں میں کامیابی سے جاری ہے۔ اس لیے جبری اور طے شدہ شادیوں میں واضح فرق قائم کیا جانا بہت ضروری ہے۔

40۔ لڑکی بھگا لے جانے یا غیر ارادی قتل وغیرہ کی صورت میں اس قسم کے معاوضے کا حکم دیا جا سکتا ہے۔

41۔ مثال کے طور پر انٹرنیشنل آرگنائزیشن آف مائیگریشن۔

ثقافتی و مذہبی جواز کے ساتھ

عورتوں پر ہونے والے تشدد سے نمٹنے کی حکمت عملیاں

اس حصہ میں کچھ ایسی حکمت عملیاں بیان کی جائیں گی جن کی مدد سے ثقافت یا مذہب کے نام پر ہونے والے تشدد سے نمٹا جا سکتا ہے۔ ان کی تیاری میں مذہب، سول سوسائٹی، حکومت، قانون اور اقوام متحدہ کے نقطۂ نظر سے مدد لی گئی ہے۔ اگرچہ ذیل میں دی جانے والی حکمت عملیوں کی درجہ بندی کی گئی ہے مگر کثیر پہلو اور کثیر سطحی حکمت عملیوں کی اہمیت پر زور دینا ضروری ہے تاہم یہ حکمت عملیاں ایک دوسرے سے آزاد نہیں ہیں۔ ہر ذیلی حصے میں ہر حکمت عملی کے فوائد پر نظر ڈالی گئی ہے اور محض ایک حکمت عملی پر انحصار سے ہونے والے ممکنہ نقصانات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

مذہبی بنیاد پر مبنی حکمت عملیاں

مذہب کے نام پر خواتین پر روا رکھے جانیوالے تشدد کے خلاف کئی مذہبی حکام آواز اٹھا چکے ہیں۔ اگرچہ یہ آراء غالب مذہبی نظریہ کا حصہ ہوسکتی ہیں اور نہیں بھی لیکن یہ مذہبی سوچ کی حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت اور تنوع کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان مذہبی علماء کا کہنا ہے کہ خواتین پر حقیقی ظلم مذہب کی ایک جامد، جابرانہ اور پدرسری تشریح ہے نہ کہ خود مذہب کی اپنی خلقی فطرت۔

مثال کے طور پر طیرے دس ہومس نامی ایک این جی او کے زیر اہتمام اردن کے دارالحکومت عمان میں منعقدہ ''غیرت'' سے متعلقہ جرائم بارے ایک کانفرنس میں شیخ التمیمی نے صاف کہا کہ غیرت کے نام پر قتل اسلامی قانون کے خلاف ہے کیونکہ قرآن

غیر مصدقہ گواہی کی بنیاد پر عمل کی مذمت کرتا ہے (سیمل اور انٹر رائٹس، 2001)۔ ایران کے آیت اللہ یوسف ثانی نے سنگساری کے خلاف فتویٰ دیتے ہوئے کہا کہ امام مہدی کی غیر موجودگی میں حدود قوانین کے تحت جسمانی سزائیں دینا حرام ہے[42]۔ ایران ہی کے آیت اللہ منتظری کے مطابق سنگساری کا مقصد لوگوں کو شادی شدہ ہو کر بھی زنا میں ملوث ہونے سے روکنا ہے۔ اسلام کے مطابق اس سزا پر عملدرآمد اتنا مشکل[43] ہے کہ عملی طور پر دیکھا جائے تو اس پر پابندی عائد ہے[44]۔

اسلام کی حالات کے مطابق ڈھلنے اور رنگا رنگ آراء کو قبول کرنے کی صلاحیت کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ روایتی مذہبی کٹّر لوگوں میں بھی مختلف فقہیں پائی جاتی ہیں جیسے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی اور شیعہ۔ ان میں سے ہر مسلک ایک خاص جغرافیائی پس منظر میں اخذ کیا گیا اور مختلف ثقافتی، سیاسی اور سماجی و معاشی حالات میں پروان چڑھا۔ ''اسلام کے اس سنہرے دور'' میں یہ تسلیم کیا گیا کہ پس منظر کی بنیاد پر مسلم قوانین میں جائز اختلاف ہو سکتا ہے اس لیے شریعت کو ترقی پسند نشو و نما کے تحت ہونا چاہیے اور پس منظر بدلنا چاہیے (BAOBAB برائے خواتین کے انسانی حقوق، 2003، صفحہ 2) اولین مسلمان فقہا نے اجتہاد (انسانی تشریح) کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ مانا کہ مسلم قوانین کو سیاق و سباق کے مطابق ڈھلنا چاہیے۔ تاہم اکثر مسلمان معاشروں میں رائج بلا سوچے سمجھے قبول کرنے کی ریت اس تصور سے نکلتی ہے کہ:

> ''اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے...'' بدقسمتی سے موجودہ مباحثے اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کے حوالے سے مسلم قانون کی ترقی کو محض اس واہمے کی بنیاد پر روکا جا رہا ہے کہ مسلم قوانین کا صرف ایک ہی ناقابل تبدیلی اور تنقید سے بالا نظام ہے جو پہلے ہی سے نافذ ہے۔ (BAOBAB برائے خواتین کے انسانی حقوق، 2003، صفحہ 2)

یاد رہے کہ اسلامی قوانین خصوصاً وہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عورتوں پر تشدد کی عوامی پیروی کرتے ہیں کو ناقابل تغیر طور پر پیش کرنے کے پیچھے سیاسی مقاصد کارفرما ہیں۔ جیسا کہ حصہ دوم میں کہا گیا کہ حکمرانوں کے مفاد میں ہے کہ وہ اس طرح سے اپنے غلبے کو جواز فراہم کریں۔

متذکرہ بالا ترقی پسندانہ مذہبی آراء کے علاوہ خود خواتین نے بھی اخلاقی اور قانونی دونوں حوالوں سے عورت کی ذات کے گرد اسلام کی تشریح کی ہے۔ وہ اسلامی تحریک نسواں کے نام سے جانی جاتی ہے[45] جو مختلف پدرسری تشریحات کو چیلنج کرتی ہے۔ عورتوں کی ترقی کو سامنے رکھ کر اسلامی تحریک نسواں کے حامی قرآن و حدیث کے نئے سرے سے مطالعہ پر زور دیتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ پدرسری تشریحات، قوانین اور روایات عورتوں کو دوسرے درجے کا مقام دیتے ہیں نہ کہ خود اسلام۔

ان کا کہنا ہے کہ صدیوں سے (خصوصاً حالیہ دہائیوں میں) اسلام کی تشریح پدرسری اور زن بیزار طریقوں سے کی جارہی ہے اور یہ کہ شرعی قانون کو غلط سمجھا اور اس کا غلط اطلاق کیا جارہا ہے اور یہ کہ قرآن کی روح اور الفاظ کو بگاڑ دیا گیا ہے (مقدم، 2006، صفحہ 87)

اسلامی ڈھانچے کے اندر عورتوں کے حقوق کا دفاع کرنے والوں کو پدرسری قوانین کو چیلنج کرنے میں خاطر خواہ کامیابی ملی ہے۔ خصوصاً ایسی جگہوں پر جہاں قوانین کی بنیاد مذہبی کتب پر ہے یا جہاں مذہبی ادارے پالیسی پر کافی اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔

عورتوں پر تشدد کے خلاف لڑنے کیلئے مذہبی دلائل اگرچہ کافی قوت مہیا کرتے ہیں لیکن اس حکمت عملی کی انتہا کا پتہ ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ اجارہ دارانہ مذہبی فہم کی نئے سرے سے تشریح ایک مفید کام ہے مگر مکمل طور پر مذہبی ڈھانچے کے اندر کام کرنے سے نہ صرف مذہبی حکام کے قانونی جواز کو تقویت ملے گی بلکہ عوامی زندگی پر مذہبی قوانین کی بالادستی کو بھی۔ کئی لوگ ابھی بھی یقین نہیں کرتے کہ صرف مذہبی بنیاد پر تشکیل کردہ حکمت عملی بڑے پیمانے پر سماجی، معاشی اور سیاسی شعبوں میں وہ تبدیلیاں لا سکے گی جن کی عورتوں کے حقوق کے حصول کی جدوجہد میں اشد ضرورت ہے۔ حتمی بات یہ کہ نئے سرے سے مذہبی نظریات کی تشریح کی حکمت عملی کچھ معاشروں میں دوسروں کی نسبت یقیناً زیادہ کامیاب رہے گی۔ لیکن اس کا انحصار اس کردار پر ہے جو مذہبی ادارے سماجی ڈھانچے میں ادا کرتے ہیں۔

مقامی سول سوسائٹی کے اقدامات

سول سوسائٹی کی تنظیمیں اور تحریکیں ثقافتی اور مذہبی بنیاد پر روا رکھے جانے والے عورتوں پر تشدد کیخلاف جدوجہد میں انتہائی سرگرم کردار ادا کررہی ہیں۔ زیر مطالعہ ہر ملک میں مقامی تنظیمیں اور کارکن شعور بیدار کرنے کی مہمیں، حقوق کی عوامی پیروی کرنے اور حکومت کے اندر لابی کرنے جیسے کاموں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے ثقافتی سے لیکر مذہبی، سیاسی اور قانونی نقطۂ نظر سے کئی طریقہ کار اختیار کر رکھے ہیں۔ درحقیقت ان مقامی کارکنوں کی مدد کے بغیر ہم اوپر ذکر کردہ تشدد کی اشکال سے ناواقف ہی رہ جاتے۔ اگر عورتوں کے حقوق کے محافظ نہ ہوتے تو ثقافتی جواز کیساتھ عورتوں پر تشدد اور صنفی بنیاد پر امتیاز سے متعلقہ دوسرے مسائل بلاشبہ آنکھوں سے اوجھل ہی رہتے اور بھلا دیئے جاتے۔ اگرچہ عورتوں پر تشدد کیخلاف سول سوسائٹی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اس مطالعہ کی گنجائش سے باہر ہے تاہم اس حصہ میں ان چند مہموں اور تنظیموں کا ذکر کیا جائیگا جو زیرِ نظر ممالک میں خصوصاً کامیاب رہیں۔

پاکستان

1990 کی دہائی سے پاکستانی عورتیں ''قتل کرنا غیرت نہیں'' کے نعرے کے تحت نام نہاد غیرت سے متعلقہ جرائم کو نارمل اور قابل قبول سمجھے جانے کیخلاف ان تھک مہم چلا رہی ہیں۔ شرکت گاہ ویمنز ریسورس سنٹر[46] کی تحریک پر شروع کردہ اس مہم نے کاروکاری کے مسئلہ پر شعور بیدار کرنے میں مدد دی ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں کچھ علاقوں مثلاً سندھ میں اس موضوع پر کھلی بحث کافی آگے بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ مقامی اخبار اب غیرت کے نام پر قتل کے مسئلے پر کھلی بحث کرتے ہیں، سیاستدان اب کوئی مؤقف اختیار کرنے کی طرف مائل ہیں اور عورتیں خود بھی مردوں کے فیصلہ سازی کے عمل میں نظر انداز کیے جانے پر زیادہ بلند آواز سے احتجاج کرتی ہیں۔ شعور کی یہ بلندی اس تاثر کو ختم کرنے کیلئے بہت اہم ہے کہ غیرت کے نام پر قتل کوئی غیر متنازعہ روایت ہے۔ جس طرح کہ مہم خود وضاحت کرتی ہے کہ یہ نام نہاد روایت عزت و غیرت کے نام پر ہونے والے ہر اس جرم سے مضبوط ہوتی اور پروان چڑھتی ہے جس کے مرتکب شخص کو سزا نہیں دی جاتی۔ جب کسی قتل کے مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے بجائے معاشرہ اسے ''قابل عزت'' قرار دے کر تعریف و توصیف شروع کر دیتا ہے (شرکت گاہ ویمنز ریسورس سنٹر، 2001)۔ شرکت گاہ سول سوسائٹی کی ان تنظیموں میں سے ایک ہے جو معاشرے کا اس حوالے سے شعور بلند کرنے کیلئے کام کر رہی ہیں کہ ''ثقافت'' کوئی ناقابل تغیر چیز نہیں ہے اس لیے ثقافت کی ناقابل تغیر شکل سے منسوب نقصان دہ افعال کیخلاف حرکت میں آنا چاہیے۔

ایران

ایران میں ''سنگساری کو ہمیشہ کیلئے روکو مہم[47]'' ثقافتی اور مذہبی جواز کی آڑ میں عورتوں پر تشدد کے خاتمے کیلئے سول سوسائٹی کے کام کی ایک اور مثال ہے۔ اس مہم کا مقصد ایران میں اسلامی تعزیرات کو بدلنا ہے تاکہ سنگسار کرنے کی سزا پر پابندی لگائی جا سکے۔ قانونی میدان میں اس جدوجہد کے نتیجے میں سنگساری کو ہمیشہ کیلئے روکو مہم کامیابی سے درجن بھر سے زائد سنگساری کی سزاؤں کو بدلوا چکی ہے۔ چند مقدمات میں تو مکمل معافی مل گئی اور دوسروں میں سزاؤں کو کم کر دیا گیا۔ شعور بیدار کرنے کی سرگرمیوں کے ذریعے اس مہم نے سنگساری کو عالمی سطح پر متعارف کروا دیا اور سنگساری کے معروف مقدمات میں ایرانی حکومت کو جوابدہ بنا دیا۔ (اس مہم سے پہلے ایرانی حکومت صاف مکر جاتی تھی کہ ملک میں سنگساری کی سزائیں ابھی بھی دی جا رہی ہے)[48]۔ اس سال ایرانی پارلیمنٹ میں نیا فوجداری قانون پیش کیا گیا ہے جس میں سنگساری پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اس تحریر کے وقت اس پر رائے شماری کا انتظار ہو رہا ہے۔ کئی لوگوں کو امید ہے کہ نیا قانون منظور ہو جائے گا۔

انڈونیشیاء

انڈونیشیا میں ''ان علاقائی پالیسیوں کو روکو جو عورتوں کیخلاف امتیاز کرتی اور انہیں مجرم ٹھہراتی ہیں'' مہم ایک ایسی تحریک ہے جو خواتین زیر اثر مسلم قوانین کے ساتھ مل کر ''عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے'' کی عالمی مہم میں کام کر رہی ہے۔ اس مہم کا آغاز 'مسلم گاؤں کا منصوبہ' کی طرف سے بولوکمبا کے علاقے میں کوڑوں کی سزا کی توثیق کے ردعمل میں کیا گیا۔ جنوبی سلاویسی میں سولیڈیریٹاس پیری پون اور کئی دوسرے علاقائی ساتھی اس میں تعاون کر رہے ہیں[49]۔ یہ سب مل کر عورتوں کو ان کے حقوق بارے شعور دے رہے ہیں اور فیصلہ سازی کے عمل میں عورتوں کی رسائی بڑھانے کی عوامی پیروی کر رہے ہیں۔ قانونی دائرے میں کام کر کے یہ مہم اب تک کئی کامیابیاں حاصل کر چکی ہے۔ ان میں پالیسی سازی کے طریقہ کار کے حوالے سے جنوبی سلاویسی کے گورنر کے ساتھ ایک مفید مکالمہ اور عورتوں کے عالمی دن کے موقع پر عوامی مظاہرہ بھی شامل ہے۔ اس وقت یہ ان گروپوں کی حمایت کر رہی ہے جو حال ہی میں آچے میں نافذ ہونے والے زنا کے قوانین کیخلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

مقامی کارکن اور تنظیمیں عورتوں پر تشدد کے خلاف لڑائی میں سب سے مؤثر رہنما ثابت ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ثقافتی و مذہبی پس منظر کے بارے سب سے بہتر پتہ ہوتا ہے اور تبدیلی لانے کیلئے وہ ان نازک معاملات میں زیادہ آسانی سے کام کر سکتے ہیں۔ اسی لیے مردوں کے غلبے والے نظام کے حکام ان کے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آتے ہیں۔ ان مقامی کارکنوں میں اجارہ دارانہ تشریحات اور ثقافت و مذہب کے غلط استعمال کو چیلنج کرنے کیلئے شاندار طاقت پائی جاتی ہے۔ یہ نہایت اہم ہے کہ انسانی حقوق کی علمبردار عالمی برادری عورتوں کے حقوق کے مقامی حمایتیوں کو نصیحت کرنے کے بجائے ان کی مدد کرے۔ ثقافتی مناسبت کے دلائل اکثر عالمی برادری کو گمراہ یا خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم ثقافتوں، مذاہب، اقوام اور صنفوں کے درمیان یک جہتی پیدا کرنا ہے جس کی بنیاد اس ''مشترکہ اقرار پر ہو کہ عورتوں پر تشدد کی بنیادی وجہ پدرسری نظام ہے اور یہ کہ عورتوں پر تشدد پدرسری نظام کی چند 'ثقافتی' شکلوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔'' (مسلم معاشروں میں عورتوں کو بااختیار بنانا، WEMC-2008)

نائیجیریا

نائیجیریا میں BAOBAB برائے خواتین کے انسانی حقوق[50] مذہبی، ریاستی اور مروجہ قوانین کے دائرہ کار میں رہ کر عورتوں کے حقوق کا تحفظ کر رہی ہے۔ نائیجیریا کے بارہ شمالی صوبوں میں جہاں شرعی قانون نافذ ہے۔ جنسی الزامات میں ملوث عورتوں کو قانونی مدد فراہم کرتی ہے۔ زنا کے کئی مقدمات میں اس نے کامیابی سے سزاؤں (کوڑے یا سنگساری) کو کم کروایا ہے۔ اس مقصد کیلئے پہلے سے موجود قوانین کا مناسب استعمال کیا گیا۔ مثلاً شرعی تعزیرات کے ان حصوں کو سامنے لایا گیا جو واقعاتی شہادت کو چیلنج کرنے میں عورتوں کی مدد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 2001 میں BAOBAB نے حفصہ ابوبکر نامی عورت کا زنا کے الزامات میں دفاع کیا۔ حفصہ پر الزام تھا کہ وہ شادی کے بغیر حاملہ ہوئی۔ اسے اعتراف جرم پر مجبور کیا گیا اگرچہ بعد میں وہ اپنے اعتراف سے منحرف ہوگئی۔ BAOBAB کے وکیل نے اسلامی قانون کے ماہرین کے حوالے سے دلیل دی کہ سزائے موت کے مقدمات میں اعتراف جرم سے انحراف کو بھی قبول کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے ''خوابیدہ جنین[51]'' کے نظریے کی بنیاد پر یہ دلیل بھی دی کہ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حفصہ کا حمل اس کی سابق شادی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے ''گواہی'' کے اندر شک پایا جاتا ہے اور شرعی اصولوں کے مطابق اسے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح حفصہ کو تمام الزامات سے بری کر دیا گیا۔ BAOBAB سول سوسائٹی تنظیموں کی ایک اور مثال ہے جو کہ مذہبی اور ثقافتی مباحث میں عورتوں کے حقوق کے دفاع اور انصاف تک رسائی کیلئے کام کر رہی ہے۔

اقوام متحدہ کے اقدامات

اقوام متحدہ نے انسانی حقوق[52] کے حوالے سے عورتوں پر تشدد کے ثقافتی و مذہبی جواز کے مسئلہ پر بڑھتے ہوئے شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس نے مسئلہ کے حل کیلئے مزید کام کیا ہے۔ اس میں کنونشنوں، مہموں اور قراردادوں کی تشکیل، رپورٹوں کی اشاعت اور ریاستوں کی جوابدہی اور جائز سرگرمی کیلئے اپیلیں شامل ہیں۔ اس حصہ میں اقوامِ متحدہ کے ان نمایاں ترین اقدامات کا ذکر کیا جائے گا جنہیں رواج، ثقافت یا مذہب کے پس منظر میں عورتوں پر تشدد کے مسئلے سے نمٹنے کیلئے خصوصی طور پر اٹھایا گیا۔

صنفی بنیاد پر امتیاز کیخلاف جدوجہد میں اقوام متحدہ کے کردار پر کسی بھی بحث کا آغاز خواتین کیخلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کا کنونشن (CEDAW) سے ہونا چاہیے۔ اگرچہ کنونشن کے اصل دستاویزات میں عورتوں پر تشدد کیخلاف کوئی واضح شق شامل

نہیں تھی مگر 1992 میں اس میں متعارف کروائی گئی عمومی سفارش نمبر 19 میں اس غلطی کا ازالہ کر دیا گیا۔ اس کے مطابق:

> صنفی بنیاد پر ایسا تشدد جو عورتوں کو عمومی عالمی قانون یا انسانی حقوق کے کنونشنوں کے تحت حاصل انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے لطف اندوز ہونے سے محروم کر دے یا اس میں خلل ڈال دے وہ کنونشن کی شق نمبر 1 کے مفہوم کے مطابق امتیازی ہے (پیراگراف 7)

اس سفارش میں ان ذمہ داریوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو حکومتوں کو ریاستی و غیر ریاستی عناصر کی طرف سے عوامی اور نجی دائروں میں عورتوں پر کیے جانے والے تشدد سے نمٹنے کیلئے ادا کرنا ہیں۔ عمومی سفارش نمبر 19 کو اقوام متحدہ کی جانب سے انسانی حقوق کے دائرہ کار کے اندر عورتوں پر تشدد کی مختلف اشکال سے نمٹنے کیلئے بعد ازاں کیے جانے والے کام کا آغاز اور بنیادی پتھر سمجھا جا سکتا ہے۔

عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کے خاتمے کا پہلا اعلامیہ 1993 میں منظور ہوا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1997، 1999، 2000، 2002 اور 2004 میں اس میں نئے اضافے کیے۔ اس اعلامیے میں اقوام متحدہ نے عورتوں پر تشدد اور اس کی وجوہات بارے عمومی تعریف طے کی ہے اور ان مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں ایسے واقعات ہو سکتے ہیں۔ 1994 میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن نے عورتوں پر تشدد، اس کی وجوہات اور نتائج بارے خصوصی ماہرین کا تقرر کیا۔[53] اس اقدام نے عورتوں میں تشدد کے مقابلے کیلئے مزید تاکید اور لگن پیدا کی اور اس کے ذریعے ہونے والے کام نے ثقافتی جواز کے ساتھ عورتوں پر تشدد بارے ہمارے فہم کو بہت بہتر کیا ہے۔

اس اعلامیے کے بعد 2006، 2007 اور 2009 میں قراردادیں لائی گئیں تاکہ ''عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کے خاتمے کیلئے کوششوں کو تیز تر کیا جائے۔'' ان قراردادوں میں عورتوں پر تشدد کی تمام شکلوں کے خاتمے کیلئے مزید کوششوں کی کال دیتے ہوئے زیادہ توجہ ارتکاب جرم کرنے والوں کو حاصل سزا کی معافی کی رعایت ختم کرنے پر دی گئی۔ اس میں زور دے کر کہا گیا کہ:

> ریاستوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ عورتوں پر تشدد کی سختی سے مذمت کریں اور اپنی ان ذمہ داریوں سے بچنے کیلئے کسی رسم، رواج یا مذہبی عذر کو پیش کرنے سے احتراز کریں جو عورتوں پر تشدد کے خاتمے کا اعلامیہ ان پر عائد کرتا ہے۔ (اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، 2009)

مزید برآں 2006 میں اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے ''عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کا گہرا مطالعہ'' کی رپورٹ پیش کی

جس کے بعد 2008 میں ''عورتوں پر تشدد کے خاتمے کی مہم'' کا آغاز ہوا۔ سیکرٹری جنرل کی رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا کہ:

> عورتوں پر تشدد پر سزا سے معافی اس تشدد کے اثرات کو کنٹرول کے طریقے کار تک بڑھا دیتی ہے۔ جب ریاستیں ارتکاب جرم کرنے والوں کی جوابدہی میں ناکام ہو جاتی ہیں تو سزا سے برّیت نہ صرف تشدد کا نشانہ بننے والوں کی محکومیت اور بے بسی کو بڑھاوا دیتی ہے بلکہ معاشرے کو یہ غلط پیغام بھی دیتی ہے کہ عورتوں پر مردوں کا تشدد قابل قبول بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ اس کے نتیجے میں تشدد پر مبنی رویوں کا رجحان ایک معمول بن جاتا ہے۔ (سیکرٹری جنرل، اقوام متحدہ، 2006)

عورتوں پر تشدد کے خاتمے کے مطالبے پر مبنی عمومی قراردادوں کے علاوہ عملی اقدام کیلئے بھی اپیلیں کی گئی ہیں۔ ''عورتوں اور لڑکیوں کی صحت کو متاثر کرنے والے روایتی یا رسوماتی عمل'' کے خلاف 1998، 1999، 2000 اور 2002 میں قراردادیں پاس کی گئیں۔ یہ قراردادیں اس بات کا اعادہ کرتی ہیں کہ... نقصان دہ روایتی یا رسوماتی عمل عورتوں اور لڑکیوں پر تشدد کی ایک مخصوص شکل اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی ہیں۔ (اقوامِ متحدہ جنرل اسمبلی، 2002) اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بھی عورتوں پر تشدد کے خلاف قراردادوں کے نفاذ کیلئے ریاستوں کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات اور عورتوں پر تشدد کا مقابلہ کرنے کیلئے سول سوسائٹی کی سرگرمیوں بارے تین رپورٹیں جاری کی ہیں[54]۔

2000، 2002 اور 2004 میں اقوام متحدہ نے ''غیرت'' کے نام پر ہونے والے جرائم کے مسئلہ بارے کئی قراردادیں پاس کیں۔ ان کا عنوان تھا ''غیرت کے نام پر عورتوں اور لڑکیوں کے خلاف کیے جانے والے ہر قسم کے جرائم کے خاتمے کیلئے کام کرنا'' ان قراردادوں میں ریاستوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم کے متعلق اپنے رویے میں مناسب سرگرمی دکھائیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم سمیت عورتوں پر تشدد کی تمام اشکال کا اعتراف کیا جائے اور ان کے مرتکب افراد کو مجرمانہ حملوں کے ملزم کے طور پر سزا دی جائے۔ اس ضرورت پر زور دیا گیا کہ غیرت کے نام پر کیے جانے والے عورتوں پر تشدد کی اصل وجوہات کا تدارک کیا جائے اور اس جذبے کا اظہار کیا گیا کہ ایسے جرائم مذہبی و ثقافتی اقدار کی خلاف ورزی ہیں۔

عالمی عدالت برائے جرائم کے 2002 میں نافذ ہونے والے قانون، روم میں پہلی مرتبہ زنا بالجبر اور جنسی تشدد کی دوسری اشکال کو انسانیت کیخلاف جرائم کے طور پر تسلیم کیا گیا[55]۔ چاہے اس کا ارتکاب ریاستی عناصر نے کیا ہو یا غیر ریاستی عناصر نے۔ اس کے بعد سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 1820 (2008) آئی جس میں جنگ زدہ علاقوں میں جنسی تشدد کو نشانہ بنایا گیا لیکن اس کا

اطلاق عورتوں پر جنسی تشدد کے واقعات میں غیر ریاستی عناصر کی جوابدہی کیلئے بھی کیا جاسکتا تھا۔[56]

ان بین الاقوامی معاہدوں کے علاوہ اقوامِ متحدہ کے نظام میں موجود محکموں اور افراد نے بھی صنفی بنیاد پر تشدد سے نمٹنے کیلئے متفقہ کوششیں کیں۔ عورتوں پر تشدد، اس کی وجوہات اور نتائج بارے خصوصی ماہرین (کوماراسوامی، ارترک اور مانجو) نے ثقافتی جواز کے ساتھ عورتوں پر تشدد کے مسائل بارے بین الاقوامی شعور بڑھانے میں بہت مدد دی ہے۔[57] 2008 میں تشدد اور دوسرے ظالمانہ، غیر انسانی یا توہین آمیز سلوک یا سزا بارے خصوصی ماہر مینفرڈ نوواک نے تشدد کیخلاف عورتوں کو تحفظ میں فراہمی میں اضافے اور تشدد کی صنفی لحاظ سے حساس تشریح کرنے بارے رپورٹ پیش کی[58] اور 2009 میں یونی فیم نے عورتوں پر تشدد سے انکار اور اس کے خاتمہ کیلئے متحد ہونے کے نعرے کے تحت ایک عالمی تحریک کا آغاز کیا۔[59]

اگرچہ انسانی حقوق کا بیان کردہ یہ ڈھانچہ ترقی کیلئے کئی مواقع فراہم کرتا ہے مگر صرف انسانی حقوق کی بحث کا استعمال ثقافت کی جامد، متعصّبانہ اور مردوں کے نقطۂ نظر سے تشریح کرنے والوں کیلئے ''نئی استعمارات'' یا ''مغربیت'' کے الزام عائد کرنے کا دروازہ کھولتا ہے۔ اس لیے ترقی پسندانہ مذہبی تشریحات، سول سوسائٹی کی تحریکوں اور انسانی حقوق کی بحث کو ملا کر حکمت عملی ترتیب دینا زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

ریاستوں کی جوابدہی

اقوامِ متحدہ کے کنونشنوں اور معاہدوں کا ایک بڑا مقصد انسانی حقوق بارے ریاستوں کے اقدامات پر ان کی جوابدہی کرنا ہے اگرچہ ان حقوق کی خلاف ورزی غیر ریاستی عناصر نے ہی کیوں نہ کی ہو۔ عالمی انسانی حقوق کے قانون کے تحت جائز کوشش کا تقاضا ہے کہ ریاستیں اپنے شہریوں کے انسانی حقوق کا احترام، حفاظت کریں اور ان عناصر کا احتساب کریں جو ان حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا بحث سے واضح ہے کہ عورتوں پر تشدد کو ہر جگہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی شمار کیا جاتا ہے۔ جائز کوشش کے معیار کے تحت ریاستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عورتوں پر تشدد کے واقعات کا تدارک و تفتیش کریں اور ان کے ذمہ داروں کو سزا دیں اور ایسے واقعات کے متاثرین کو معاوضہ ادا کریں۔ اس تقاضے کے تحت ریاستوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ ایسے تشدد کا ارتکاب کرنے والے افراد کون ہیں یا یہ جرائم کہاں ہو رہے ہیں یعنی یہ ریاست یا اس کے ایجنٹ ہیں یا غیر ریاستی عناصر ''نجی دائرہ کار'' میں اس میں ملوث ہیں۔

تاہم سرگرمی و جاں فشانی کے اس معیار کے باوجود ریاست کے مثبت اقدامات بارے بات کرنا مشکل ہے۔ جیسا کہ جوڈتھ

وائٹن بیچ کہتی ہے کہ کئی موقعوں پر ریاست اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کرسکتی ہے:

1۔ معاہدہ کی توثیق کے وقت: بین الاقوامی اور علاقائی انسانی حقوق کے معاہدوں کی توثیق کے وقت مذہبی/ ثقافتی تحریک پر تحفظات کا اظہار یا تشریحی اعلامیے (مثلاً اس معاہدہ کے تحت خاندان میں مرد وعورت کے مساوی حقوق کی ذمہ داریوں کا اطلاق صرف ان ذمہ داریوں پر ہوگا جو نافذ شدہ مذہبی قوانین سے مطابقت رکھتی ہوں گی۔)

2۔ انسانی حقوق کی قبولیت کی سطح: انسانی حقوق کی ذمہ داریوں کے نفاذ میں حائل مذہبی/ ثقافتی رکاوٹوں کا عذر پیش کرنا

3۔ مقامی نفاذ کی سطح: ریاست کی جانب سے نجی دائرہ کار یا پولیس افسروں اور عدلیہ کے ارکان کے مذہبی/ ثقافتی رویوں میں مداخلت سے ہچکچاہٹ اکثر عورتوں پر تشدد کے مسئلہ سے نمٹنے میں غفلت پیدا کرتی ہے۔ اس ذمرے میں غیر ضروری طویل کارروائی، بے عملی اور ارتکاب جرم کرنے والوں کو بچانے کیلئے حرکت میں آنا بھی شامل ہے (وائٹن بیچ، 2008، صفحہ 229)

معاہدے کی توثیق کے حوالے سے CEDAW سے متعلق پاکستان کی مثال یہ ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح مذہب/ ثقافت کے حوالے سے تحفظات/ اعلامیے کے ساتھ توثیق کنونشن کی افادیت کو ختم کرتی ہے۔ پاکستان نے معاہدے کی (ماسوائے شق نمبر 29 کے پیراگراف نمبر 1 بارے ایک خاص تحفظ کے اظہار کے) کُلی توثیق کردی ہے لیکن اس کے ساتھ شریعت کی بالادستی کا بھی اعلان کیا ہے۔ (معاشی وسماجی کمیشن برائے ایشیا و پیسیفک، 2009) سوائے ایران اور سوڈان کے WRRC کے مطالعہ میں شامل باقی ممالک نے کنونشن کی توثیق کی ہے[60]۔ ایران نے اس بنیاد پر کنونشن پر دستخط نہیں کیے کہ یہ ''اسلامی قانون کیخلاف ہے'' حالانکہ ایران نے بچوں کے حقوق کے کنونشن پر ان تحفظات کے ساتھ دستخط کردیئے تھے کہ وہ کسی ایسی شق کے نفاذ کی ذمہ داری قبول نہ کرے گا جو ''اسلامی قانون سے متصادم'' ہو[61]۔

WRRC ممالک کی حقیقی کمزوریاں، ریاست کے رپورٹ کرنے اور عورتوں پر تشدد کے انسدادی اقدامات کے مقامی سطح پر نفاذ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اگرچہ زیر بحث حکومتوں (اور بہت سی دوسری جن کا اس مطالعہ میں ذکر نہیں) نے اپنے دساتیر میں عورتوں کو حقوق دیئے ہیں اور عورتوں سے متعلقہ انسانی حقوق کے کئی عالمی معاہدوں اور کنونشنوں کی توثیق کی ہے مگر ان حقوق کا نفاذ بہت کمزور ہے۔ غیر ریاستی عناصر کے علاوہ خود ریاستیں بھی عورتوں پر جبر کیلئے ''ثقافت'' اور ''مذہب'' کے بطور ہتھیار استعمال میں اکثر ساز باز کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر گھریلو تشدد کے خاتمے کے انڈونیشی ایکٹ میں (بشمول شوہر کی طرف سے زبردستی ہم بستری، سیڈا، انسانی حقوق، صنفی مساوات اور عدمِ امتیاز کی طرف مخصوص حوالوں کے) کئی ترقی پسند قوانین شامل

ہیں لیکن انہیں اکثر نافذ نہیں کیا جاتا۔ (جیسنگ و دیگر، 2009)

> خصوصاً آچے میں کئی قوانین جن کا مقصد عورتوں پر تشدد خصوصاً گھریلو تشدد کو جرم قرار دینا، مردوں کے غلبے والے معاشروں کی سماجی و ثقافتی حقیقتوں کو مسترد کرنا ہے کو اکثر مکمل طور پر نافذ نہیں کیا جاتا۔
> (معاشی و سماجی کمیشن برائے ایشیاء و پیسیفک، 2009، صفحہ 7)

ان ذکر کردہ رکاوٹوں کے باوجود ریاستوں کو اپنی عالمی/ قانونی ذمہ داریوں کیلئے جوابدہ ٹھہرانا ایک اہم حکمت عملی ہے۔ عورتوں پر تشدد کو ایک جرم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے طور پر تسلیم کروانے میں کئی کامیابیاں عورتوں کی تحریکوں اور تنظیموں کی طرف سے ریاست کی ذمہ داریوں کو نشانہ بناتے ہوئے چلائی گئی مہموں کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ کئی حکومتوں کو اتنے دھڑلے سے منافقت کا اظہار کرتے دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے مگر بین الاقوامی اداروں اور خواتین تنظیموں کیلئے ابھی بھی ضروری ہے کہ وہ ریاستی سطح پر اپنی عوامی پیروی جاری رکھیں اور ان ریاستوں کا ان کے وعدوں اور ذمہ داریوں کے حوالے سے احتساب کرتی رہیں۔

حوالہ جات

42۔ ثانی کے (فارسی میں) مکمل بیان کیلئے دیکھئے: http://www.rozonline.com/archives/2007/08/006654.php سنگساری بارے ترقی پسند مذہبی آراء پر مزید معلومات کیلئے دیکھئے ٹرمین اور فجابی کا اختصاریہ۔

43۔ اکثر تشریحات میں زنا ثابت کرنے کیلئے چار گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اعتراف سے انحراف بھی قابل قبول ہونا چاہیے اور اگر یہ سزا کسی حوالے سے ایمان میں کمزوری کا باعث بن سکتی ہو تو اس پر عملدرآمد نہیں ہوسکتا۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے ٹرمین اور فجابی۔

44۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے: http://www.stopstoning.net/spip.php?article4

45۔ اسلامی تحریک نسواں پر مزید معلومات کیلئے دیکھئے مقدم، 2002۔

46۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے: http//www.shirkatgah.org

47۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے: www.meydaan.org

48۔ ایران میں سنگساری کے خلاف مہم بارے مزید معلومات کیلئے ٹرمین اور فجابی کا اختصاریہ ملاحظہ ہو۔

49۔ اس مہم بارے مزید معلومات کیلئے دیکھئے: http://www.stop-stoning.org/node/637

50۔ مزید معلومات کیلئے دیکھئے: http://www.baobabwomen.org/

51۔ مالکی مسلک میں ''خوابیدہ جنین کے تصور بارے مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو BAOBAB برائے خواتین کے انسانی حقوق، 2003۔

52۔ عورتوں پر تشدد کیخلاف اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کیلئے دیکھئے: http://www.un.org/womenwatch/daw/vaw/v-work-ga.htm

53۔ رادھیکا کوماراسوامی (1994، سے 2003، تک)، یقین ارترک (2003، سے 2009 تک)، راشدہ منجو (اگست 2009، سے اب تک)۔

54۔ ان تینوں رپورٹوں میں توجہ کا مرکز نسوانی جنسی اعضاء کی قطع و برید کا مسئلہ ہے۔

55۔ دیکھئے: http://www.icc-cpi.int/NR/rdonlyres/EA9AEFF7-5752-4F84-BE94-OA655EB30E16/O/Rome_statute_English.pdf

56۔ دیکھئے: open Element http://daccess-dds-ny.un.org/doc/UNDOC/GEN/N08/391/44/pdf/N0839144.pdf?

57۔ دیکھئے: http://www.2.ohchr.org/english/issues/women/rapporteur/

58۔ دیکھئے: http://www.unhcr.org/cgi-bin/texis/vtx/refworld/rwmain?docid=47c2c5452

59۔ دیکھئے: http://www.unifem.org/campaigns/sayno/

60۔ ان ممالک نے CEDAW کی توثیق یا تو تحفظات کے بغیر کی تھی اور یا معمولی تحفظات کے ساتھ لیکن یہ تحفظات قانونی وجوہات کی بناء پر تھے نہ کہ ''ثقافتی'' یا ''مذہبی'' دلائل کی بنیاد پر۔

61۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں CEDAW کی توثیق کرنے والے کئی ممالک نے اس بناء پر اہم تحفظات کا اظہار کیا ہے کہ اس کی کچھ شقیں مقامی قوانین خصوصاً وہ جو عائلی قانون اور شخصی مقام سے متعلقہ ہیں، سے متصادم ہیں۔

سفارشات

عورتوں پر تشدد کے ثقافتی/ مذہبی جوازوں سے ہم کس طرح بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں؟ اگر چہ مختلف حکمت عملیوں پر کی گئی بحث کافی مختصر ہے مگر اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورتوں پر تشدد کے خلاف جنگ میں مختلف حالات میں مختلف حکمت عملیاں اختیار کرنا پڑیں گی۔ اس مطالعہ میں شامل ممالک نہ صرف ایک دوسرے سے الگ الگ حالات رکھتے ہیں بلکہ ان میں صوبائی اور حتیٰ کہ گاؤں کی سطح تک بھی اندرونی طور مختلف ہیں۔ کوئی بھی حکمت عملی منتخب کرتے وقت بڑی، درمیانی اور چھوٹی سطح پر حالات کو بھی مدنظر رکھا جانا چاہیے تاہم اس مطالعہ میں پیش کردہ تقابلی جائزہ ان مختلف معاشروں کے کچھ مشترکہ نکات کو سامنے لے کر آتا ہے۔ ان سے ہمیں ثقافتی جواز کے ساتھ عورتوں پر ہونے والے تشدد کیخلاف جنگ کو مجموعی طور پر سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے جس طرح کہ اس مقالے کے اندر بار بار کہا گیا کہ ''ثقافت'' یا ''مذہب'' کو عورتوں پر تشدد کیلئے جواز بنانے والے عموماً اپنی تشریح کو ''مسیح'' اور ''مستند'' گردان رہے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ دوسری آراء کی وقعت کو گھٹاتے ہیں۔ ''ثقافت'' اور ''مذہب'' کے تصورات کی پراسراریت کو ختم کرنا ''مستندگی'' کا دعویٰ کرنے والوں کے ذاتی مفادات کو بے نقاب کرنا اور متبادل آراء کو سامنے لانا بہت ضروری ہے تاکہ اس ڈھانچے کے اندر کام کرنے کے قابل ہوا جا سکے۔ جس طرح کہ آشیش نندی کہتے ہیں کہ ''روایت کو نئے سرے سے ایجاد کرنا سب سے بڑی روایت ہے'' عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے کی عالمی مہم کی بنیادی حکمت عملی اس فقرے سے ظاہر ہوتی ہے کہ: عورتوں پر ظلم اصل میں اسلام یا کسی اور مذہب یا ثقافت کا مردوں کی بالادستی کی عینک سے مطالعہ ہے جس کی تشکیل مرد حکمران کرتے اور تشدد کے ذریعے برقرار رکھتے ہیں۔

عورتوں کے انسانی حقوق کا دفاع کرنے والوں کو بالآخر ثقافتی جواز کے ساتھ عورتوں پر تشدد بارے ایک کثیر الجہت اور پرت در پرت نقطۂ نظر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ اس میں ریاستوں کو ان کی انسانی حقوق کی ذمہ داریوں کے حوالے سے جوابدہ ٹھہرانا ضرور شامل ہونا چاہیے۔ ایسی ترقی پسند مذہبی اور ثقافتی تشریحات کو سامنے لایا جائے جو ثقافتی و مذہبی اقدار اور انسانی حقوق کے عالمی اصولوں کے درمیان مطابقت اور مرد و عورت کے درمیان مساوات پر دلائل دے۔ اس کے ساتھ ساتھ خصوصاً عورتوں، ترقی پسند رہنماؤں اور برادریوں میں شعور بڑھانے کیلئے ہمیں چلائی جانی چاہئیں۔ علاوہ ازیں:

> ہمیں ثقافتوں، نسلوں، طبقات، صنفوں، مذاہب، دینداری، قومیتوں اور اقوام کے درمیان اتحاد اور یک جہتی کی تعمیر جاری رکھنی چاہیے۔ ایسی یک جہتی میں ہی یہ صلاحیت ہوگی کہ وہ تمام معاشروں میں عورتوں پر ظلم کیلئے ''ثقافت'' کے بطور ایک ہتھیار استعمال کو مسترد کرنے کیلئے درکار سماجی تحریک پیدا کر

دے۔(مسلم معاشروں میں عورتوں کو بااختیار بنانا، WEMC، 2008)

بظاہر وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں مگر ثقافتی یا مذہبی جواز کے ساتھ عورتوں پر تشدد کی اصل جڑ مردوں کی بالادستی والی تشریحات ہیں جن کے گرد طاقت کے تعلقات کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔عورتوں کے قتل اور سنگساری کے خاتمے کی عالمی مہم ثقافت اور مذہب کے غلط استعمال کو مسترد کرتی ہے جبکہ ہم ثقافتوں، مذہب اور روایات کی ایسی اصلاح اور دوبارہ تعمیر چاہتے ہیں جن کی بنیاد اقدار کے ایک ایسے نظام پر ہو جس میں سب کیلئے احترام، برداشت اور کشادگی پائی جائے۔

Bibliography

کتابیات

Alatas, S. (1977). Problems of Defining Religion. *International Social Science Journal,* 29(2):213-234.

Amnesty International (2003). Afghanistan: "No one listens to us and no one treats us as human beings": Justice denied to women. Index Number: ASA 11/023/2003 October 5, 2003. *http://www.amnesty.org/en/library/asset/ASA11/023/2003/en/39a4c8fd-d693-11dd-ab95-a13b602c0642/asa110232003en.pdf*

Amor, A. (2009). Study on freedom of religion or belief and the status of women in light of religion and traditions. Civil and political rights, including the question of religious intolerance. Report submitted by Mr. Abdelfattah Amor, Special Rapporteur, in accordance with Commission on Human Rights resolution 2001/42. Commission on Human Rights. Fifty-eighth session. Item 11 of the provisional agenda. Distr. General: E/CN.4/2002/73/Add.2. 24 April 2009. *http://www.wunrn.com/un_study/english.pdf*

BAOBAB for Women's Human Rights (2003). Sharia Implementation in Nigeria: The Journey So Far.

Bauer, J. and Hélie, A. (2006). *Documenting Women's Rights Violations by Non-State Actors.* Rights and Democracy, Women Living Under Muslim Laws.

Benninger-Budel, C. and Bourke-Martignoni, J. (2003). Violence against Women: 10 Reports/Year 2002.

Chilendi, J. (2008). Violence Against Women in Conflict and Post Conflict Situations. Paper presented to VI African Development Forum, 18-21 November 2009. Addis Ababa, Ethiopia.

CIMEL and INTERIGHTS (2001). Roundtable on strategies to address `crimes of honour': Summary report. Women Living Under Muslim Laws.

Cockburn, C. (2004). The Continuum of Violence: A Gender Perspective on War and Peace. In Giles, W. and Hyndman, J., (eds.), *Sites of Violence: Gender and Conflict Zones,* pages 24-44. Berkeley: University of California Press.

Coomaraswamy, R. (1999). Integration of the human rights of women and the gender perspective: Violence against women. Report of the Special Rapporteur on violence against women, its causes and consequences, Ms. Radhika Coomaraswamy, in accordance with Commission on Human Rights resolution 1997/44. Economic and Social Council. Commission on Human Rights. Fifty-fifth session. Item 12(a) of the provisional agenda. Distr. General: E/CN.4/1999/68/Add.2. January 4, 1999. *http://www.unhchr.ch/Huridocda/Huridoca.nsf/0/7560a6237c67bb118025674c004406e9?OpenDocument*

Coomaraswamy, R. (2003). International, regional and national developments in the area of violence against women 1994-2003. Integration of the Human Rights of Women and the Gender Perspective. Violence Against Women. Report of the Special Rapporteur on violence against women, its causes and consequences, Ms. Radhika Coomaraswamy, submitted in accordance with Commission on Human Rights resolution 2002/52. Addendum 1. Commission on Human Rights. Fifty-ninth session. Item 12 (a) of the provisional agenda. Distr. General: E/CN.4/2003/75/Add.1. 27 February 2003. http://www.unhchr.ch/Huridocda/Huridoca.nsf/0/a9c6321593428acfc1256cef0038513e/$FILE/G0311304.pdf

Coomaraswamy, R. (2005). The Varied Contours of Violence Against Women in South Asia. Paper presented at the Fifth South Asia Regional Ministerial Conference, Celebrating Beijing Plus 10. Islamabad, Pakistan. Government of Pakistan and UNIFEM South Asia Regional Office.

Economic and Social Commission for Asia and the Pacific (2009). Implementation of the Convention on the Elimination of all Forms of Discrimination against Women in Asia and the Pacific: Successes and challenges. http://www.unescap.org/ESID/GAD/Events/HLM-2009/download/BPA09_INF4.pdf.

Ertürk, Y. (2003). Situation of women and girls in Afghanistan. United Nations General Assembly. Human rights questions: Human rights situations and reports of special rapporteurs and representatives. Fifty-eighth session. Agenda item 117(c). Distr. General: A/58/421. 6 October 2003. *http://www.unhchr.ch/huridocda/huridoca.nsf/2848af408d01ec0ac1256609004e770b/4d099bc67f0526edc1256dd700503b65/$FILE/N0355646.pdf*

Ertürk, Y. (2006). Integration of the human rights of women and a gender perspective: Violence against women. *http://www.universalhumanrightsindex.org/documents/848/822/document/en/text.html*

Ertürk, Y. (2007). Intersections between culture and violence against women. Implementation of the General Assembly Resolution 60/251 of 15 March 2006 Entitled "Human Rights Council". Report of the Special Rapporteur on violence against women, its causes and consequences, Yakin Erturk. Human Rights Council. Fourth session. Item 2 of the provisional agenda. Distr. General: A/HRC/4/34. 17 January 2007. *http://daccess-ods.un.org/TMP/3670902.25219727.html*

Farahani, F. (2007). *Diasporic Narratives of Sexuality: Identity Formation among Iranian-Swedish Women.* Stockholm: Stockholm University.

Hountondji, P. (1988). The Master's Voice: Remarks on the Problem of Human Rights in Africa. In Ricoeur, P., (ed.), *Philosophical Foundations of Human Rights: A World Survey.* Paris: UNESCO.

Human Rights Watch (2009). "We have the promises of the world": Women's rights in Afghanistan. <http://www.hrw.org/en/reports/2009/12/03/we-have-promises-world>

Hussain, M. (2006). "Take My Riches, Give Me Justice": A Contexual Analysis of Pakistan's Honor Crimes Legislation. *Harvard Journal of Law Gender,* 29(1):223-46.

Idrus, N. and Bennett, L. R. (2003). Presumed consent: marital violence in Bugis society. In Manderson, L. and Bennet, L. R., (eds.), *Violence against Women in Asian Societies,* pages 41-60. London, UK: Routledge Curzon.

Irfan, H. (2008). Honor related violence against women in Pakistan. Paper prepared for the World Justice Forum, Vienna. *http://www.lexisnexis.com/documents/pdf/20080924043437_large.pdf*

Jaising, I., Basu, A., and Dutta., B. (2009). Domestic violence legislation and its implementation: An analysis for ASEAN countries based on international standards and good practices. *http://www.popcouncil.org/pdfs/events/2010PGYSem_DomesticViolenceLegislation.pdf*

Kandiyoti, D. (1991). Women, Islam and the State. *Middle East Report,* pages 9-14.

Kennedy Bergen, R. (1999). Marital Rape. In *In Brief, Violence Against Women Online Resources.*

Khudsen, A. (2004). License to kill: Honour killings in Pakistan. CMI Reports: WP 1. Chr. Michelsen Institute. *http://www.cmi.no/publications/file/?1737=license-to-kill-honour-killings-in-pakistan*

Mamdani, M. (1993). Social movements and constitutionalism: The African context. In Greenberg, D., (ed.), *Constitutionalism and Democracy: Transitions in the Contemporary World,* pages 172-185. Oxford University Press.

Mas'udi, M. (1997). *Islam dan Hak-Hak Reproduksi Perempuan.* Mizan: Bandung.

Moghadam, V. (2002). Islamic Feminism and its Discontents: Toward a Resolution of the Debate. *Signs: Journal of Women in Culture and Society,* 27(4):1135-1171.

Moghadam, V. M. (2006). Religion based violence against women and feminist responses: Iran, Afghanistan, and Algeria. In von Braun, C., Brunotte, U., Dietze, G., Hrzan, D., Jahnert, G., and Pruin, D., (eds.), *`Holy War' and Gender ('Gotteskrieg unt Geschlecht),* Berliner Gender Studies Series, pages 75-92. Berlin: VIT VERLAND.

Moser, C. (2001). The gendered continuum of violence and conflict: An operational framework. In Moser, C. and Clark, F. C., (eds.), *Victims, Perpetrators, or Actors? Gender, Armed Conflict and Political Violence,* pages 30-52. London: Zed Books.

Narayan, U. (2004). Undoing the `package picture' of cultures. In Masters, S., editor, *Dossier 26.* London: Women Living Under Muslim Laws.

Sadr, S. (2006). The revival of the abandoned law of stoning. Translated by Meriyam. *http://www.stopstoning.net/spip.php?article11*

Shaheed, F. (2008). Violence against women legitimised by arguments of `culture': Thoughts from a Pakistani perspective. In *Due Diligence and its Application to Protect Women from Violence,* pages 241-248. Leiden: Koninklijke Brill.

Shirkat Gah (2001). Karo Kari, Tor Tora, Siyahkari, Kala Kali (There is no `honour' in killing). Lahore: Shirkat Gah Women's Resource Centre.

Southall Black Sisters (2001). Forced marriage: An abuse of human rights. Southall: SBS.

Sudan Organization Against Torture (SOAT (2006). Annual report on the human rights situation in Sudan. *http://www.sudantribune.com/IMG/pdf/SOAT_Annual_Report_2005-2006.pdf*

Terman, R. (2010). To specify or single out: Should we use the term `honor killings'? *Muslim World Journal for Human Rights,* Forthcoming.

Thomas, C. (2009). Forced and early marriage: A focus on Central and Eastern Europe and former Soviet Union countries with selected laws from other countries. United Nations Division for the Advancement of Women and United Nations Economic Commission for Africa. Expert Group Meeting on good practices in legislation to address harmful practices against women. United Nations Conference Centre. Addis Ababa, Ethiopia. 25 to 28 May 2009. Distr. General: EGM/GPLHP/2009/EP.08. June 19, 2009. *www.un.org%2Fwomenwatch%2Fdaw%2Fegm%2Fvaw_legislation_2009%2FExpert%2520Paper%2520EGMGPLHP%2520_Cheryl%2520Thomas%2520revised_.pdf*

UNICAMP Center for Gender Studies (2006). *Family Life: A Comparative Per-spective on `Crimes of Honour'.* Campinas: UNICAMP. International meeting, Campinas, 25-27 August, 2004.

United Nations General Assembly (2002). Resolution adopted by the General Assembly: 56.128. Traditional or customary practices affecting the health of women and girls. Fifty-sixth session. Agenda item 112. Distr. General: A/RES/56/128. January 30, 2002. *www.childinfo.org/files/fgmc_UNResolution56128.pdf*

United Nations Secretary General (2006). In-depth study on all forms of violence against women: Report of the Secretary General. United Nations General Assembly. Sixty-first session. Item 60(a) of the preliminary list. Advancement of women. Distr. General: A/61/122/Add.1. July 6, 2006. *http://daccess-ods.un.org/TMP/1141151.18980408.html*

United Nations Secretary General (2009). Intensification of efforts to eliminate all forms of violence against women: Report of the Secretary-General. United Nations General Assembly. Sixty-fourth session. Item 64 of the provisional agenda. Advancement of women. Distr. General: A/64/151. 17 July 2009. *http://daccess-ods.un.org/TMP/1102658.html*

Welchman, L. and Hossain, S. (2005). *`Honour': Crimes, Paradigms and Violence against Women.* Zed Books.

Women's Empowerment in Muslim Contexts (WEMC) (2008). Rejecting 'cultural' justifications for violence against women: Strategies for women's rights advocates. Strategy paper for the Research Programme Consortium on `Women's Empowerment in Muslim Contexts: Gender, Poverty and Democratisation from the Inside Out'. *http://www.wemc.com.hk/web/Dec_07/Rejecting%20'cultural'%20justifications_070308final.pdf*

Women's Empowerment in Muslim Contexts (WEMC) and Solidaritas Perempuan (2009). A successful campaign to halt sharia laws in South Sulawesi. *http://www.wemc.com.hk/web/e-bulletin/09-2009/files/campaign_against_discriminatory_regulations_bulukumba.pdf*

Working Group on Forced Marriage (2000). A choice by right. London: Home Office Communications Directorate.

Wyttenbach, J. (2008). Violence against women, cultural/religious traditions and the international standard of due diligence. In Benninger-Budel, C., editor, *Due Diligence and its Application to Protect Women from Violence,* pages 225-239. Leiden: Martinus Nijhoff Publishers.

Zuhur, S. (2009). Considerations of honor crimes, FGM, kidnapping/rape and early marriage in selected Arab nations. Expert Paper prepared for the United Nations Expert Group Meeting on good practices in legislation to address harmful practices against women. Addis Ababa, Ethiopia.

خواتین زیرِ اثر مسلم قوانین
Women living under muslim laws
النساء في ظل قوانين المسلمين
Femmes sous lois musulmanes

لاہور: e-mail: sgah@sgah.org.pk
کراچی: e-mail: shirkat@cyber.net.pk
پشاور: e-mail: sgpesh@gmail.com
ویب سائٹ: www.shirkatgah.org

شرکت گاہ
ویمنز ریسورس سنٹر